Regd. L. No.7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1983

اس پرچہ میں

مومن کی زندگی

(صفحہ ۳۳ تا صفحہ ۹۴)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون : ۸۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک -/۸۶ ر	خط وکتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور	۳ تین روپے
جلد ۳۶	دسمبر ۱۹۸۳ء	شمارہ ۱۲

فہرست

۱۔ لمعات .. (پیامِ اقبالؒ) .. ۲

۲۔ نقد و نظر .. ۴

۳۔ قرآنی درس کے اعلانات .. ۶

۴۔ اجتماعِ نمائندگان .. ۸

۵۔ اسلامی مملکت کسے کہتے ہیں؟ .. (محترم پرویز صاحب) .. ۹

۶۔ باب المراسلات .. ۱۷

۷۔ حقائق و عبر ● کیا احمدی مسلمان ہیں ● فرقہ وارانہ اختلافات ● ایران میں اسلامی تعلیم ● فنڈامنٹل ازم ● نظریہ ضرورت کا اسلام .. ۲۵

۸۔ [redacted] .. ۳۳

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبدالحمید، مقام اشاعت: ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور، مطبوعہ: اشرف پرنٹنگ پریس ۹۔ ایبک روڈ۔ لاہور۔

باسمہٖ تعالیٰ

لمعات

ہمارے ہاں ایک پرانا محاورہ ہے ـــ سانپ کے منہ میں چھپکلی، نہ نگلے بنے نہ اگلے۔
اگرچہ تشبیہ تو ناموزوں سی ہے لیکن محض محاورہ کی جہت سے کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ارباب دانش وبینش کے ہاں اقبالؒ (اور قائداعظمؒ) کی کچھ ایسی ہی صورت ہے۔ ان سے عوام کو عقیدت بلکہ محبت ہے۔ اس لئے ان حضرات کو ان کی یادیں منانی پڑتی ہیں۔ انہیں طوعاً و کرہاً ایسا کرنا تو پڑتا ہے لیکن ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا پیغام عوام کے سامنے نہ آنے پائے۔ اس سال اوائل نومبر میں ہفتۂ اقبال منایا گیا یکم نومبر کو ٹی وی پہ اعلان ہوا ـــ کلامِ اقبالؒ۔ اور وہ کلام یہ تھا۔

جان دے کر تمہیں جینے کی دعا دیتے ہیں

اگلے روز پھر اعلان ہوا ـــ کلامِ اقبالؒ۔ اور سنایا یہ گیا۔

محبت کو دولت بڑی جانتے ہیں ۔۔۔ اسے مایۂ زندگی جانتے ہیں

اس کے بعد لاہور میں اقبالؒ کی یاد میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی جس پر (سنا ہے) لاکھوں روپے خرچ ہوئے۔ اس میں بلند بام، ادیبوں، شاعروں، فلاسفروں نے مقالے پڑھے۔ ان میں اقبالؒ کو ایک عظیم شاعر ثابت کیا گیا۔ اسی اقبالؒ کو جس نے کہا تھا۔

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم ۔۔۔ مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست ۔۔۔ کہ برمن تہمتِ شعر و سخن بست (زبورِ عجم)

فلاسفرز اٹھے تو انہوں نے اقبالؒ کے مابعد الطبیعیاتی فلسفہ پہ مقالات کے انبار لگا دیئے حالانکہ وہ کہہ گیا تھا کہ:۔

اگر نہ سہل ہوں تجھ پہ زمیں کے ہنگامے ۔۔۔ بری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی!

ان میں سے کسی نے یہ نہ بتایا کہ اقبالؒ نے زمین کے ہنگاموں کے متعلق بھی کچھ کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ:۔

(۱) برتر از گردوں مقامِ آدم است [redacted]
(۲) کس دریں جا سائل و محروم نیست ۔۔۔ عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست
(۳) بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے ۔۔۔ خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ! کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

(۴) کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار عیش کا پتلا ہے محنت ہے اسے ناسازگار
حکمِ حق ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

(۵) اٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو!

اقبالؔ نے سرمایہ اور محنت کے مسئلہ کے بعد، زمینداروں کی طرف رخ کیا اور کہا:

الارض للہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!

قارونوں کے لئے اس پیغام کے بعد اس نے ہامانوں (مذہبی پیشواؤں) کی طرف نگاہ اٹھائی اور کہا

دینِ حق از کافری رسوا تر است زانکہ مُلّا مومنِ کافر گر است
دینِ کافر، فکر و تدبیرِ جہاد دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

اس نے اقامتِ دین کے مدعیوں اور احیاءِ اسلام کے دعویداروں سے کہا کہ جسے تم اسلام کہہ کر پکارتے ہو، تمہیں معلوم ہے کہ وہ ہے کیا؟

تمدن، تصوف، شریعت، کلام بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ امت روایات میں کھو گئی

پھر اس نے فراعنۂ دھر کو للکارا اور کہا کہ تمہیں اپنے جیسے انسانوں پر حکومت کرنے کا حق کیا ہے؟ انسانوں کی حکومت ملوکیت ہے، خواہ وہ عصرِ کہن کی شہنشاہیت ہو یا دورِ حاضر کی آمریت یا مغربی جمہوریت۔ اس نے کہا:

ہنوز اندر جہاں، آدم غلام است نظامش خام و کارش ناتمام است
غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم ؐ کہ در دینش ملوکیت حرام است

حکومت صرف خدا کی جائز ہے، اور اس کا عملی ذریعہ اسکی کتاب کی حکمرانی ہے۔ وہ کتاب (قرآن) جو

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے۔ نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اور سو بات کی ایک بات کہ ——— گر تو می خواہی مسلماں زیستن۔ نیست ممکن جز بقرآں زیستن

یہ تھا اقبالؔ کا پیغام جس کے متعلق ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب!

نقد و نظر

قارئینِ طلوعِ اسلام، چودھری حبیب احمد (مرحوم) سے متعارف ہیں ——— اور ایک حلقۂ طلوعِ اسلام ہی پر کیا موقوف ہے۔ وہ کون ہے جو تحریکِ پاکستان سے کسی نوعیت سے بھی وابستہ رہا ہو، اور چودھری صاحب (مرحوم) سے متعارف نہ ہو۔ وہ، تحریکِ پاکستان کے آغاز ہی سے جو اس کے ساتھ وابستہ ہوئے تو عمر کے آخری سانس تک "وفاداری بشرطِ استواری" کی مثال قائم کرتے ہوئے، اس سے بدل و جان وابستہ رہے۔ ایک طرف مطالبۂ تحریک، اور نظریۂ پاکستان کے لئے جو نغمہ خواں، اور دوسری طرف، جرأت اور بیباکی کا یہ عالم کہ جس نے ان کے خلاف ایک لفظ بھی کہا، اس کے سامنے برہنہ شمشیر۔ اس سلسلہ میں معلومات جمع اور مرتب کرنے کی دھن، دیوانگی کی حد تک عمر بھر ان کے ساتھ رہی۔ تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں نمایاں کردار نیشنلسٹ علماء اور (کالعدم) جماعتِ اسلامی کے امیر (سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم) نے ادا کیا تھا۔ چودھری صاحب (مرحوم) نے سب سے پہلے "تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" کے موضوع پر ایک ہزار سے بھی زائد صفحات پر مشتمل کتاب شائع کی جسے اس موضوع پر معلومات کا انسائیکلو پیڈیا کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کے بعد، "جماعتِ اسلامی کا رنگ کردار" کے عنوان سے دوسری کتاب شائع کی جس کا متن اس کے عنوان سے ظاہر ہے۔ اس کے بعد وہ مزید معلومات حاصل اور جمع کرنے کے "جنون" میں مصروف رہے۔ پرویز صاحب کے ساتھ ان کے مراسم تھے۔ وہ ان سے ملنے آتے تو ادارہ میں بھی تشریف لے آتے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ تحریکِ پاکستان کی تاریخ کی مثلث ان تین اضلاع پر مشتمل ہے ——— قائداعظمؒ نے کیا کیا ——— مودودی (مرحوم) نے اس کی کس طرح مخالفت کی ——— اور پرویز صاحب نے اس کی مدافعت میں کیا کچھ کیا۔ اس موضوع پر انہوں نے معلومات کا انبار لگا دیا۔ پھر اسے کتابی شکل دی۔ اور (کتاب کے ناشر کے الفاظ میں) اس کی کتابت شدہ آخری کاپی کی تصحیح سے فارغ ہوئے تو اگلی دنیا کی طرف روانہ ہو گئے (طاب لہٗ وحسن مآب)۔ اس کتاب کو ان کے خلف الصدق، پروفیسر رفیق احمد صاحب نے اس نام سے شائع کیا ہے جو خود مرحوم کا تجویز کردہ نظر آتا ہے۔

علامہ اقبالؒ قائدِ اعظمؒ، پرویز، مودودی اور تحریکِ پاکستان۔

کتاب کا نام ہی اس کے مشمولات کا ترجمان ہے۔ ضخامت اس کی نو سو صفحات سے زائد ہے۔ اس پر اس کے سوا کسی تبصرہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ کشمکشِ تحریکِ پاکستان کے متعلق . . .

جس قدر معلومات اس میں فراہم کر دی گئی ہیں وہ شاید ہی کہیں اور مل سکیں۔ علامہ اقبالؒ، قائداعظمؒ، پرویز صاحب، اور مودودی صاحب (مرحوم) تو خیر اس میں عمودی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے علاوہ جن شخصیات یا واقعات کا ضمنی تذکرہ بھی آ گیا ہے۔ ان کے متعلق بھی معلومات کا انبار لگا دیا گیا ہے۔ چودھری صاحب (مرحوم) معلومات کو یکجا کر دیا کرتے تھے۔ انہیں ترتیب نہیں دیا کرتے تھے یہی کیفیت اس کتاب کی بھی ہے۔

مؤلفِ کتاب تو ہمارے شکریہ کی حدود سے ماوراء جا چکے ہیں۔ ان کے صاحبزادہ پروفیسر رفیق احمد ہمارے اور ملتِ پاکستانیہ کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اتنی ضخیم کتاب کو شائع کر کے ان معلومات کو محفوظ کر دیا۔ ہم ان تمام احباب کو، جو تحریکِ پاکستان کی تاریخ سے کچھ بھی دلچسپی رکھتے ہیں تاکیدی مشورہ دے دیں گے کہ وہ اس کتاب کو ضرور حاصل کر لیں اور جلدی حاصل کر لیں کہ اس قسم کی کتابیں اکثر ناپید ہو جایا کرتی ہیں۔

اتنی ضخیم، مجلد کتاب کی قیمت -/۸۵ روپے زیادہ نہیں۔

ملنے کا پتہ:

پروفیسر رفیق احمد نمبر ۹۶۸۔ الف۔ گلستان کالونی فیصل آباد۔

میرے اب یہاں آشنا اور بھی ہیں

شکر ایزدی کہ قرآن کی آواز کے لئے فضا زیادہ مساعد ہوتی جا رہی ہے۔ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ قرآنی لٹریچر کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے اور بہت سے نامانوس گوشوں کی طرف سے بھی اس کے لئے تقاضے موصول ہو رہے ہیں۔ علاوہ ازیں حال ہی میں دو مقامات پر جدید بزمیں بھی قائم ہوئی ہیں۔

(۱) ناروے میں اوسلو کے مقام پر پہلے سے بزم قائم ہے اور نہایت سرگرم۔ اب اسی ملک کے ایک اور شہر فریڈرک سٹیڈ (FREDRIKSTAD) میں بزم قائم ہوئی ہے جس کے نمائندہ محترم بشیر احمد بٹالوی منتخب ہوئے ہیں۔

(۲) پاکستان میں سرگودھا میں بھی بزم کا قیام عمل میں آیا ہے۔ محترم ماسٹر فیروز الدین صاحب اس کے نمائندہ منتخب ہوئے ہیں۔

ادارہ ان دونوں بزموں کے قیام اور ہر دو نمائندگان کے تقرر کی توثیق کرتا ہوا دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ ان رفقاء کی ہمتوں میں برکت اور حوصلوں میں رفعت عطا فرمائے۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جیسے مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف؛ نوٹ: پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں۔
لاہور	ہر جمعہ ½۹ بجے صبح	۲۵-بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ½۳ بجے صبح	76. PARK ROAD. ILFORD, TELEPHONE NO 553-1896
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	بذریعہ وی سی آر 335 DRIFT WOOD AVE. #311, DOWNS VIEW, TORONTO (ONT.) M3N-2P3, TEL: (416) 661-2827
پشاور	۱- ہر جمعہ ۵ بجے شام ۲- ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیق بین صدر (بالمقابل VIP MAIN GATE PESHAWAR STADIUM) شیریں محل B 3 یونیورسٹی ٹاؤن، باڑہ روڈ فون: ۴۴۴۵۹
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف - محمود علی صاحب، اتمان خیل بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی-۱۴۴ لیاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینیکل انجینئرنگ ورکس۔ شہید روڈ لیہ
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی، مکان ۳۳۔ نظامی منزل
فیصل آباد	ہر جمعہ ½۳ بجے شام	بمقام حیات سرجری کلینک، ۲۳/یٰ پیپلز کالونی سر فون: ۴۲۸۵۵
ہنگو	ہر جمعہ ½۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ۔ فون: ۶۷
چکسی تحصیل کبیر والا (ملتان)	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام: مطب حکیم احمدالدین صاحب (نمائندہ بزم)
ملتان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	دفتر میسرز شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ فون: ۳۱۰۷۱
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی فیری شفا خانہ - غنی پورہ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے: ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر، توغی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم، ملحق رہائش گاہ: چودھری مقبول شوکت صاحب۔ گل روڈ (رسول لائنز)
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ اور ہر اتوار ۲ بجے سہ پہر	بمقام ۱۱/۱۰- بی، بھمبر روڈ۔ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ایبٹ آباد	۱- ہر جمعہ ۴ بجے سہ پہر ۲- ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	رہائش گاہ: صلاح الدین صاحب، واقع: L-K-234 کیہال (ایبٹ آباد) " غلام مصطفیٰ اعوان صاحب واقع K-356 کچہ گراؤنڈ (ایبٹ آباد)

محترم پرویز صاحب کے درس قرآن بذریعہ VCR کے

کوائف اوقات و مقام متعلقہ بزم ہائے طلوع اسلام

کراچی (پاکستان)

ہر جمعہ ½ 9 بجے صبح

دارالتہرہ بالائی منزل

بالمقابل سٹاپ بس نمبر ۲۰

سرمد روڈ (کراچی صدر)

گجرات (پاکستان)

ہر جمعرات ۳ بجے سہ پہر

رہائش گاہ: ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب

جناح کالونی (گجرات)

ٹیلیفون: ۳۴۳۰ ۳۰۴۰

اوسلو (ناروے)

ہر اتوار

شام ۴ بجے بمقام

MR MANZOOR AHMAD
DOVRE GATE- 7/OSLO-1

برمنگھم (انگلینڈ)

ہر ماہ کا پہلا اتوار

۱۲ بجے دوپہر

227/229 ALUM ROCK ROAD
38.3BH (BIRMINGHAM)

فریڈرک سٹاڈ (ناروے)

ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا اتوار

شام ۴ بجے بمقام

MR BASHIR (BATALVI)
ARNE— SVENDSENS. G.T.1
1600 FREDRIK STAD (NORWAY)

آپ آگئے تو رونق کاشانہ ہوگئی۔

جب حالات مساعد تھے تو طلوعِ اسلام ہر سال اپنی عظیم القدر کنونشن منعقد کیا کرتا تھا۔ اب صرف وقتاً فوقتاً طلوعِ اسلام کی بزموں کے نمائندگان کے اجتماع پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ امسال یہ اجتماع (۷، ۸، ۱۹۸۱) نومبر کو منعقد ہوا جس میں اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کی بزموں کے نمائندگان نے شرکت کی۔ طلوعِ اسلام کی تحریک کا مقصد قرآنی فکر اور تعلیم کی نشر و اشاعت ہے، اور اس کی بزمیں اسی پروگرام کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہیں۔ یہ نمائندگان قرآنی فکر کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس قدر ہم آہنگ اور یک رنگ رفقاء کا اجتماع کس قدر سکون افزا اور مسرت خیز ہوگا۔ اجتماع کی تاریخ ۷، ۱ تھی لیکن کوئٹہ کے رفقاء ۱۶ کی شام تشریف لے آئے تھے اور کراچی کے نمائندہ ان سے پہلے۔ ۷، ۱ کی صبح آمد کا آغاز کراچی کے قافلہ سے ہوا۔ اور پھر دوپہر تک، گجرات، راولپنڈی، فیصل آباد، جلال پور جٹاں، ملتان، سرگودھا، چک سبز، اشالی، پنڈدادن خان، مردان، جلہ جیم، پنج کسی، پشاور، کمالیہ، ایبٹ آباد، ہنگو، بوریوالہ، وہاڑی، سنکر گڑھ، لاہور چھاؤنی کے احباب جمع ہوگئے۔ لاہور کی بزم میزبان تھی۔ دوپہر کے کھانے اور نمازِ ظہر کے بعد پہلی نشست میں، پرویز صاحب نے سال بھر کے کوائف اور حالاتِ حاضرہ پر، قرآنی روشنی میں بصیرت افروز تبصرہ فرمایا اور کہا کہ جوں جوں غیر قرآنی نظریات کی تاریکی بڑھ رہی ہے، قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی ضرورت شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے بعد شیخ عبدالحمید صاحب نے ادارہ کی کارکردگی کی روئداد پیش کی۔ یہ اجلاس نمازِ عصر ادا کرنے کے لئے ملتوی ہوا۔ ازاں بعد ادارہ کی کارکردگی اور مستقبل کے پروگرام کے متعلق تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ رات کے کھانے کے بعد پرویز صاحب کی سوال و جواب کی محفل منعقد ہوئی۔ دوسری صبح ناشتہ کے بعد جملہ رفقاء درس میں شرکت کے بعد بادیدۂ نم رخصت ہوئے اور ادارہ کو یہ کہنے کے لئے پیچھے چھوڑ گئے کہ،

ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اداس ہیں۔ تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے۔ (ناظم ادارہ)

(صفحہ ۲۲ کا بقیہ)

اور مذہب کے علمبردار اسے حکمِ خداوندی قرار دیتے ہیں:-

یہاں پہنچ کر ہمیں پھر اپنے اس رفیق کا قول یاد آرہا ہے جس نے کہا تھا کہ آپ اس دور میں یہ باتیں کیسے سنا رہے ہیں؟ یہ درست ہے۔ ہمیں بھی اس کا احساس ہے کہ جب تک ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ اسلام مروّج رہے گا، ہر داعیٔ قرآن کی کیفیت یہی رہے گی کہ،

مثالِ شمعِ مزار ہے تو، تری کوئی انجمن نہیں ہے (اقبالؒ)

لیکن بایں ہمہ جب کوئی پوچھتا ہے تو ہمیں بتانا ہی پڑتا ہے۔ قرآن کا ہم سے یہی تقاضا ہے۔

اسلامی مملکت کسے کہتے ہیں؟

(پرویز)

ایک صاحبِ علم اور صاحبِ فکر دوست نے پرویز صاحب سے ایک خصوصی ملاقات کے دوران، مذکورہ بالا موضوع سے متعلق کچھ سوالات پوچھے۔ ان کے جوابات سے اس اہم موضوع کے مختلف گوشے اس طرح نکھر کر سامنے آ گئے ہیں کہ ہم نے مناسب سمجھا کہ انہیں طلوعِ اسلام کے صفحات میں منضبط اور محفوظ کر لیا جائے، اور قارئین طلوعِ اسلام کو اس "خوانِ یغما" میں شریک۔ وھو ھٰذا۔

سوال:۔ پرویز صاحب! آجکل اس سوال نے خاص اہمیت حاصل کر رکھی ہے کہ اسلامی مملکت کسے کہتے ہیں۔ آپ نے اس موضوع پر بڑی کثرت سے لکھا ہے لیکن وہ مختلف مقامات پر بکھرا ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ، مرتکز انداز سے، مختصر الفاظ میں اس کی وضاحت فرما دیں۔

جواب:۔ محترمی! آپ ادیب ہیں، اس لئے، آغازِ گفتگو آپ ہی کی زبان میں کیوں نہ کیا جائے۔ آپ نے جگر کا یہ شعر تو سنا ہوگا۔

ع ہم وردکے مارول کا اتنا سا فسانہ ہے۔ سمٹے تو مرا دل ہے پھیلے تو زمانہ ہے۔

یہی کیفیت اسلامی مملکت سے متعلق موضوع کی ہے۔ اختصار ہی چاہیئے تو بات دو فقرں میں ختم ہو جاتی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس کے لئے کئی ضخیم مجلدات درکار ہوں گی میری ساری کاوشیں یہی بتانے کے لئے تو ہیں کہ "خدا کا تختِ اجلال زمین پہ کیسے بچھے گا"۔

مختصر الفاظ میں اسلامی مملکت وہ ہے جس میں خدا کی حکومت قائم ہو۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) خدا کا ارشاد ہے۔ یعنی حقِ حکومت خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ وہ اپنے اس حق میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶)۔ اس نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ،

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۸) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اس کے پاس ضابطۂ قوانین ہو یا انتظامیہ، حتیٰ کہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں میرے محکوم بن جاؤ۔

غور کیجئے کہ اس ارشادِ باری تعالیٰ کی رُو سے، جب نبی کو بھی اس کا حق نہیں تو۔ "تا بدیگراں چہ رسد"!
لہٰذا، جس مملکت میں خدا کی حکومت "قائم ہو" اسے اسلامی حکومت کہا جائے گا۔

سوال:۔ لیکن خدا تو ایسی غیر محسوس، غیر مرئی ہستی ہے جو ہمارے خیال اور قیاس تک میں نہیں آسکتی۔ وہ نہ کبھی کسی کے سامنے آتا ہے، نہ ہم سے بات کرتا ہے۔ اس کی حکومت کس طرح قائم ہوگی؟

جواب:۔ اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی عظیم حقیقت بیان کی ہے جس نے دنیائے سیاست میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ دنیا میں حکومتیں اشخاص کے ذریعے قائم ہوتی تھیں۔ اس نے کہا کہ اب اشخاص کا زمانہ لد گیا۔ اب حکمرانی قانون کی ہوگی۔ جس کا قانون رائج ہوگا، حکومت اس کی سمجھی جائیگی۔ لہٰذا اسلامی مملکت میں حکمرانی خدا کے قوانین کی ہوگی جنہیں اس نے اپنی کتاب (قرآن مجید) میں محفوظ کر کے دنیا کو دے رکھا ہے۔ اب، اسلامی اور غیر اسلامی حکومت ہی کا نہیں۔ اسلام اور کفر، مومن و کافر کا بھی یہی معیارِ امتیاز ہے۔ خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (5/44)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

رسول اللہؐ نے سب سے پہلے اسلامی حکومت قائم کی تو حضورؐ سے ارشاد ہوا:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5/48)

ان کے معاملات کے فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق کیا کرو۔

بالفاظِ دیگر، اسلامی مملکت، قوانینِ خداوندی نافذ کرنے کی ایجنسی ہوگی۔

(ضمناً) اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر کہ حکمرانی قانون کی ہوگی، نہ کہ اشخاص کی، "شخصی خدا" (PERSONAL GOD) کے تصور کو بھی ختم کر دیا۔ اس نے اپنے ضابطۂ قوانین (قرآن) کے متعلق کہہ دیا کہ یہ مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی، اور اس کے ساتھ محفوظ بھی۔ اس حقیقت کی بھی وضاحت کر دی کہ اب انسانوں کا خدا کے ساتھ تعلق انہی قوانین کی رُو سے ہوگا، براہِ راست نہیں ہوگا۔ اسی سے ختمِ نبوت کا مفہوم بھی واضح ہو گیا۔

سوال:۔ آپ نے کہا ہے کہ اسلامی مملکت میں حکمرانی خدا کے قوانین کی ہوگی جو قرآن مجید میں محفوظ ہیں۔ کیا قرآن کریم میں وہ تمام احکام موجود ہیں جن کی تمام انسانوں کو قیامت تک ضرورت پیش آئے گی؟

جواب:۔ نہیں ایسا نہیں۔ قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ اس میں، بجز معدودے چند احکام، اصول و اقدار دی گئی ہیں۔ اسلامی مملکت ان احکام کو نافذ کرنے کے طور طریق، اور ان اصول و اقدار کی عملی جزئیات اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود وضع کریگی۔ قرآن کے احکام و اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن اسلامی مملکت کی وضع کردہ جزئیات عند الضرورت بدلتی رہیں گی (اقبالؔ کے الفاظ میں) "ثبات و تغیّر" کے اس امتزاج سے اسلام ابدی طور پر نافذ العمل رہے گا

سوال :۔ یہ جزئیات کون مرتب کرے گا اور کیسے مرتب ہوں گی۔

جواب :۔ اسلامی مملکت نہ کسی فرد کی ملکیت ہوتی ہے، نہ اس پر کسی گروہ کی اجارہ داری ہوتی ہے۔ اس مملکت کو ساری امت قائم کرتی ہے وہی ان جزئیات کو مرتب کرے گی۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے یہ کہکر واضح کر دیا کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) ان کے امور مملکت باہمی مشاورت سے طے پائیں گے۔ اس آیت میں لفظ "امر" بڑا جامع ہے۔ اس میں تشکیل و قیام حکومت سے لے کر جملہ امورِ مملکت سب شامل ہیں۔ حکومت کے اسلامی ہونے کی اولیں شرط یہ ہے کہ وہ امت کے مشورہ سے قائم ہو۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اسلام میں حصولِ اقتدار کیلئے کوئی طریق مقرر نہیں تو یہ قرآنی تصورِ مملکت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ امورِ مملکت میں حصولِ اقتدار کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اگر اقتدار غیر اسلامی طریق سے حاصل کیا جائے تو وہ مملکت اسلامی کیسے کہلا سکے گی۔ مشاورت حصولِ اقتدار کی بنیادی شرط ہے۔ پھر "بینھم" سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہ مشاورت صرف امتِ مسلمہ کے افراد کے مابین ہو گی۔ اس میں غیر مسلم شریک نہیں ہو سکیں گے۔

مشاورت کے ضمن میں ایک اور اہم نکتہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ حضور نبی اکرمؐ کو بھی مشاورت کا حکم دیا گیا تھا، یہ کہکر کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳/۱۵۹) "اے رسول! امورِ مملکت میں ان سے (امت سے) مشورہ کیا کرو۔ رسول اللہؐ اسلامی مملکت کے اولیں سربراہ تھے لیکن حضور کی یہ سربراہی، رسول ہونے کی جہت سے تھی۔ امت کے مشورہ سے عمل میں نہیں آئی تھی۔ اس لئے حضورؐ سے تو کہا گیا کہ "تم ان سے مشورہ کیا کرو" حضورؐ کے بعد امت کے متعلق کہا گیا کہ یہ امورِ مملکت باہمی مشورہ سے طے کریں گے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ سربراہِ مملکت بھی مشورہ کرنے والوں کے زمرہ میں شامل ہو گا۔ اس کی ان سے الگ (کوئی منفرد) حیثیت نہیں ہو گی۔ رسول اللہؐ کی مشاورت اور امتِ مسلمہ کی مشاورت کے اس فرق کی روشنی میں کئی اہم اصول مستنبط ہو سکتے ہیں۔ اس مشاورت کا طریقِ کار کیا ہو گا۔ اسے، قرآن نے خود متعین نہیں کیا۔ اسے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اسے خود متعین کرے۔ اگر اسے قرآن خود متعین کر دیتا تو کچھ عرصہ کے بعد وہ ناقابلِ العمل ہو جاتا۔

سوال :۔ آپ نے فرمایا ہے کہ اسلامی مملکت کا نظام، امت کے باہمی مشورہ سے طے پائیگا۔ یہی اصول مغربی حکومتوں میں بھی کارفرما ہے۔ جسے جمہوریت کہا جاتا ہے۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے۔

جواب :۔ مغربی جمہوریت میں قانون سازی کا کلی اور غیر محدود اختیار جمہوری ادارہ کو ہوتا ہے۔ یعنی انسانوں کو ـــــ اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، یہ کفر ہے۔ لہٰذا یہ نظام (جسے سیکولرازم کہا جاتا ہے) مغربی جمہوریت کا ہو یا آمریت کا، اسلام کی یکسر نقیض ہے۔

اسلامی نظام مشاورت میں، تمام امور کے فیصلے قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کئے

جائیں گے۔ ان حدود کو توڑنے یا ان سے تجاوز کرنے کا اختیار نظامِ مشاورت تو ایک طرف، پوری کی پوری اُمّت کو بھی حاصل نہیں ہوگا۔

سوال:۔ اگر یہ نظام (مشاورت) کسی فیصلہ میں قرآنی حدود سے تجاوز کر جائے تو اس کی اصلاح کی کیا صورت ہوگی؟

جواب:۔ اسلامی مملکت میں یہ نظام، استبدادِ ملوکیت کی طرح قوم کے سر پر مسلط نہیں ہوگا جس میں حالت یہ ہوتی ہے کہ ——— یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری ———
اس میں اُمّت کے ہر فرد کے پاس مظہر بن قرآن ہوگا اور اسے پوری پوری آزادی حاصل ہوگی کہ جس بات کو وہ قرآن کے خلاف سمجھے، اسے برملا کہہ دے۔ مملکت کا فریضہ ہوگا کہ وہ اس کی بات سنے۔ وہ صحیح کہہ رہا ہو تو اپنے فیصلہ کی تصحیح کرے۔ اس کی بات صحیح نہ ہو تو اس کا اطمینان کرائے۔

سوال:۔ اگر قوم میں کوئی فرد بھی ایسا نہ ہو تو پھر کیا کیا جائے؟

جواب:۔ تو پھر یہ قوم اسلامی مملکت کا نام نہ لے۔ اپنے ہاں سیکولر نظام قائم کرے۔ اسلامی نظام تو قائم ہی اس اُمّت میں ہو سکتا ہے جسے قرآن کا علم ہو۔ اور یہ اسلامی مملکت کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ قوم میں قرآن کی تعلیم عام کرے۔

اس مقام پر اس حقیقت کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ جو قوم اپنے غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنا چاہیے، وہ اس کے آخری مقام تک آہستہ آہستہ بتدریج پہنچ سکے گی۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہوگی کہ وہ اس منزل تک پہنچنے کے لئے برابر قدم اٹھاتی چلی جائے گی۔ اور اس کا کوئی قدم قرآن کے خلاف نہ اٹھے۔

سوال:۔ لیکن قرآن مجید کے احکام میں (INTERPRETATION) یعنی تعبیر کا بھی تو فرق ہوگا۔ اس کا حل کیا ہوگا؟

جواب:۔ یہ خیال اگر ابلہ فریبی نہیں تو بہت بڑی مغالطہ آفرینی پر مبنی ہے۔ قرآن کریم دو قسم کی آیات پر مشتمل ہے۔ ایک وہ جن کا تعلق حقائق و رموزِ فطرت سے ہے۔ قرآن کریم نے ان مضمر حقائق کو تشبیہات اور استعارات کے رنگ میں بیان کیا ہے اس لئے ان آیات کو متشابہات کہہ کر پکارا ہے۔ علمی تحقیق و تجسس سے ان حقائق کا مفہوم بے نقاب ہوتا جائے گا۔ ارشادِ خداوندی ہے:۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41/53)

ہم ارباب دانش و بینش کو عالمِ انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے تاآنکہ ان پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے، صداقت پر مبنی ہے۔

یعنی جوں جوں علم انسانی بڑھتا جائے گا ان مستور حقائق پر پڑے ہوئے پردے اُٹھتے جائیں گے اور ہر پردہ اٹھنے کے بعد جو حقیقت سامنے آئے گی وہ قرآن کے دعویٰ کی صداقت کی شہادت دیگی ظاہر ہے کہ ان آیات کی تعبیر (INTERPRETATION) مختلف ادوار میں بھی مختلف ہوگی۔

اور ایک ہی دور میں مختلف ارباب فکر وتحقیق کے ہاں بھی مختلف۔ یہ اختلاف فکری اور نظری ہوگا انسان کی عملی زندگی سے متعلق نہیں ہوگا۔

انسان کی عملی زندگی کے متعلق آیات کو اللہ تعالیٰ نے محکمات کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ احکام جن کا مفہوم متعین طور پر واضح کر دیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے اپنے سمجھنے کا جو طریق بتایا ہے، اگر اسے اس طریق کے مطابق سمجھا جائے تو ان احکام کی تعبیر میں کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ ﴿ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴾ (4/82)

"کیا یہ لوگ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت اختلافات پاتے"

آپ تو خود صاحبِ فکر ہیں اس لئے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ قرآن نے جو کہا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں تو اس سے معنوی (یعنی تعبیر کا) اختلاف مراد ہے۔ لفظی اختلاف تو یونہی نظر آجاتا ہے، اس کے لئے غور وتدبر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ غور وفکر کی ضرورت، تعبیر یا مفہوم کے سمجھنے کے لئے ہوتی ہے۔ یہ تمام اختلافات جنہیں قرآن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے (اور ایسا کرنے والے یہ نہیں سمجھتے کہ اس سے قرآن کا منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ ہی معاذ اللہ باطل قرار پا جاتا ہے) ہماری غلط نگہی کا نتیجہ ہیں۔ جرأتِ عرض معاف ہو تو خود اپنی مثال پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ میں گذشتہ (کم از کم) چالیس سال سے قرآن کریم کے متعلق لکھتا چلا آرہا ہوں اور آپ بھی میری فکری کاوشوں کا مطالعہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ کیا آپ کو آیات محکمات کے مفہوم میں کہیں کوئی اختلاف نظر آیا ہے؟ یہ اختلاف اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب قرآن کے ساتھ خارج از قرآن عناصر کو ملا دیا جائے۔

؎ میرے ساقی نے عطا کب ہے مئے بے درد وصاف ۔ رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

سوال: آپ نے فرمایا ہے کہ قرآنی احکام پر عمل پیرا ہونے کے طور وطریق اور قرآنی اصولوں کی جزئیات ہر دور کی اسلامی مملکت خود متعین کرے گی۔ فقہی قوانین تو جزئیات ہی ہیں۔ ان کی دینی حیثیت کیا ہوگی؟

جواب: اس ایک اصول کو سمجھ لینے سے اس قسم کے تمام سوالوں کا جواب از خود مل جائیگا وہ نکتہ یہ ہے کہ دین خدا کا عطا فرمودہ ہے جسے اس نے قرآن میں مکمل کر دیا ہے۔ جو کچھ قرآن سے باہر ہے وہ دین نہیں۔ دین پر عمل کرنے کے طریق ہیں جو غیر متبدل نہیں ہوسکتے۔ فقہی قوانین کی یہی حیثیت ہے۔ یہ کسی زمانے میں مقننین نے وضع کئے تھے جو بہرحال انسان تھے۔ انسانوں کے وضع کردہ احکام کو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل قرار دینا انہیں الوہیاتی مرتبہ عطا کر دینا ہے جو شرک ہے۔ بعد کی اسلامی مملکت ان سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ ان کی پابند نہیں ہوسکتی۔ مذہب اور دین

میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے۔ مذہب میں روایات کی پابندی ہوتی ہے، دین میں احکامِ خداوندی کی۔ مذہب پر غیر اسلامی معاشرہ میں بھی عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے، دین صرف اسلامی مملکت میں کارفرما ہو سکتا ہے۔ مذہب پر تو بھارت کے مسلمان بھی عمل کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ روس تک میں بسنے والے مسلمان بھی۔ لہٰذا مذہبی احکام (احکامِ فقہ) کو نافذ کر کے یہ سمجھ لینا کہ اسلام کا احیاء ہو رہا ہے، بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کے بعد مسلمانوں کا دین کی طرف آنا بہت مشکل ہے، وہ ان احکام پر عمل پیرا ہونے کے بعد اپنے آپ کو اطمینان دلا لیتے ہیں کہ وہ اسلام کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تحریک پاکستان کے دوران مطالبۂ پاکستان کے مؤیدین اور اس کے مخالفین میں یہی کشمکش تھی۔ پاکستان میں انہی (مخالفین) کے تصورِ اسلام (یعنی مذہب) کی تجدید کی جا رہی ہے۔ اس سے دین کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کا ازالہ شاید صدیوں میں جا کر بھی نہیں ہو سکے گا۔

سوال: یہاں تک ہم نے اسلامی مملکت کی ہیئت ترکیبی کے متعلق گفتگو کی ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اس مملکت کی وہ خصوصیات کیا ہوں گی جو اسے غیر اسلامی مملکتوں سے متمیز کر دے۔ یعنی جن سے یہ پہچانی جا سکے۔

جواب: یہ سوال بھی آپ کے پہلے سوال جیسا ہے جس کے جواب کے متعلق کہا جائے گا کہ ؎

تفصیل معنی غم الفت طویل ہے ۔ اور ویسے تو خفیف سا اک دل میں درد ہے

اور چونکہ اس گفتگو میں اختصار سے ہی کام لیا جا سکتا ہے اس لئے میں یہ عرض کروں گا کہ:

(۱) اس مملکت میں تمام مسلمان امتِ واحدہ ہوں گے۔ ان میں نہ مذہبی فرقے ہوں گے نہ سیاسی جماعتیں۔

(۲) اس میں پبلک اور پرسنل لاز کی کوئی تفریق نہیں ہوگی۔ تمام قوانین پبلک ہوں گے جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔

(۳) اس میں کوئی فرد رات کو بھوکا نہیں سوئے گا۔ تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا مملکت کی ذمہ داری ہوگی۔

(۴) اس میں ہر انسان، انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہوگا۔

(۵) اس میں تمام معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ:

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸)

نہ کسی کو کسی قسم کا خوف ہوگا۔ نہ حزن

حزن کو تو آپ سمجھتے ہی ہیں کہ کیا ہوتا ہے؟ ملال، افسردگی، دل گرفتگی، پریشاں خاطری۔

سوال: میں ان میں سے صرف ایک خصوصیت کی وضاحت چاہوں گا۔ یعنی اس خصوصیت کی اس میں تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری مملکت کے سر ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ اس قدر گراں بار ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے مملکت کے پاس ذرائع کیا ہوں گے؟

جواب:۔ اس کے لئے تمام ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں رہیں گے۔

سوال:۔ لیکن یہی کچھ کمیونسٹ کہتے ہیں۔

جواب:۔ اگر کمیونسٹ یہی کچھ کہتے ہیں تو ہمیں خوش ہونا چاہیئے کہ جو بات قرآن نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کہی تھی اپنے ناکام تجربات کا ستایا ہوا انسان بالآخر اسی کی طرف آیا ہے! لیکن وہ یہ کچھ کہتے ضرور ہیں، اس نظام کو عمل میں نہیں لا سکتے۔ آپ کو میرا وہ خطاب یاد ہو گا جس میں میں نے کہا تھا کہ "جہاں مارکس ناکام ہو گیا اس سے آگے"! آپ نے دیکھا ہے کہ یہ نظام روس اور چین دونوں میں یکسر بری طرح ناکام رہا ہے! یہ اس لئے کہ ان کے ہاں (اقبال کے الفاظ میں) وہ اساس نہیں جس پہ اس نظام کی فلک بوس عمارت استوار کی جا سکے۔ قرآن وہ انسان تیار کرتا ہے جو اتنے بڑے بوجھ کو اپنے کندھوں پہ اٹھا سکیں۔ وہ انسان جن کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ يُؤْثِرُونَ عَلٰىٓ اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) "وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پہ ترجیح دیتے ہیں"۔ یہ وہ انسان ہوتے ہیں جو اس قدر وسیع و عریض ذرائع پیداوار اپنی تحویل میں رکھنے کے باوجود، خود اس وقت کھاتے ہیں جب انہیں یقین ہو جائے کہ ملک میں کوئی بھوکا نہیں سویا۔ نظام میں خرابیاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب اختیارات اور ذرائع پیداوار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوں جن میں وہ تغیر خویش پیدا نہ ہو چکا ہو جسے قرآن پیدا کرتا ہے۔ علامہ اقبال نے قرآن کے متعلق کہا تھا کہ - "آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا" یہ انسان کو ویسا بنا دیتا ہے جیسا خدا چاہتا ہے کہ وہ بنے"۔ قرآن ان انسانوں کی کیفیت یہ بتاتا ہے کہ وَمَا تَشَآءُونَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۷۶/۳۰) "وہ چاہتے ہی وہ ہیں جیسا خدا چاہتا ہے کہ وہ چاہیں" یعنی وہ قوانین خداوندی کی اطاعت اسطرح کرتے ہیں کہ ان کے خیالات، خواہشات، آرزوئیں، ارادے، عزائم، مقاصد سب اقدار خداوندی کے تابع ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ان کی صورت میں یہ خدشہ ہی پیدا نہیں ہو سکتا کہ لامحدود ذرائع ان کی تحویل میں ہوں، اور اس سے کچھ خرابی پیدا ہو جائے۔

ہماری اصل غلطی یہ ہے کہ ہم بات نظام خداوندی کی کرتے ہیں اور ہمارے سامنے انسان وہی ہوتے ہیں، جیسے ہم ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے (یعنی ہمارے) ہاتھ میں تمام ذرائع پیداوار تو ایکطرف تھوڑے سے اختیارات بھی آ جائیں تو ہم نشۂ اقتدار سے بدمست ہو جاتے ہیں۔ مودودی صاحب (مرحوم) نے جب میرے پیش کردہ نظام ربوبیت کی مخالفت کی تھی تو اس کی وجہ یہی غلط نگہی تھی، انہوں نے کہا تھا:۔

> درحقیقت اسلامی نظریۂ تمدن و اجتماع سرے سے اس تخیل ہی کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں اور پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائے جو ان ذرائع پر متصرف ہو۔ جن ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہیں انہی ہاتھوں میں اگر سوداگری اور

کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظامِ زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا

(مسئلہ ملکیتِ زمین ص۱۰۲)

آپ نے غور فرمایا کہ یہ اعتراض کس غلط فہمی پر مبنی ہے؟ اسی غلط فہمی پہ کہ بات قرآنی نظام کی ہو رہی تھی اور ان کے ذہن میں موجودہ مسلمان تھے۔ قرآن پہلے "خدا کے بندے" تیار کرتا ہے اور پھر انہیں خدائی امانات کا امین بناتا ہے۔ قرآنی نظام (معاذاللہ) شیطانی نظام نہیں۔ یہ شیاطین ہیں جو ہر نظام کو شیطانی بنا دیتے ہیں۔

سوال:۔ "خدا کے بندے" کسطرح بنائے جاتے ہیں۔

جواب:۔ اسی طرح جسطرح حضور نبی اکرمؐ نے ارشادِ خداوندی کے مطابق بنائے تھے۔ یعنی يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ سے۔ علم و دانش کی رُو سے قرآن کریم کی تعلیم اور صحیح تربیت سے تعمیرِ نفس۔ جب تک اس پروگرام کے مطابق "خدا کے بندے" تیار نہیں ہوں گے، اسلامی مملکت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔ اس وقت تک اسلامی نظام۔ اسلامی قوانین۔ اسلامی تمدن وغیرہ کے نام سے سادہ لوح مسلمان کا استحصال (EXPLOIT) کیا جاتا رہے گا۔

سوال:۔ لیکن اس وقت تو دنیا کے کسی مسلمان ملک میں، اسلامی مملکت کا وجود تو درکنار، اس قسم کی تعلیم و تربیت کا پروگرام بھی کارفرما نظر نہیں آتا۔

جواب:۔ اور اسی لئے ساری دنیا کے مسلمان، خدا کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ یعنی محتاج بھی اور محکوم بھی۔ اپنی مملکت کے اندر اپنے جیسے انسانوں کے محتاج و محکوم، اور بین الاقوامی سطح پر سپر پاورز کے محتاج و محکوم! قرآن اسے "عذابِ مہین" سے تعبیر کرتا ہے، یعنی ذلّت آمیز عذاب۔

شکریہ

طلوعِ اسلام کی قیمت میں اضافہ

ہر شے کی گرانی نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ماہنامہ طلوعِ اسلام کی قیمت میں اضافہ کر دیا جائے جنوری کے شمارہ سے (جو یکم جنوری ۱۹۸۴ء کو شائع ہوگا) اندرونِ ملک، طلوعِ اسلام کا سالانہ چندہ ۴۸ روپے ہوگا۔ اور قیمت فی پرچہ ۴ روپے۔ جو حضرات پرچہ بذریعہ رجسٹری منگانا چاہیں، ان سے رجسٹری کی فیس (۳ روپے) الگ لی جائے گی۔ سابقہ خریداروں سے یہ قیمت اس وقت لی جائے گی جب ان کا سابقہ چندہ ختم ہو جائے گا۔

۲۔ بیرونِ ملک خریداروں کو چندہ کی اطلاع الگ دی جائے گی۔

بابُ المراسلات

سیاسی پارٹیاں

سوال :۔ صدر مملکت نے یہ اعلان کر کے کہ مجوزہ انتخابات (غالباً) غیر جماعتی انداز پر ہوں گے، ملک کو جدید بحث و جدل کا اکھاڑہ بنا دیا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے گویا ملک قوم کے باقی تمام مسائل حل ہو چکے ہیں اور صرف ایک مسئلہ باقی ہے۔ اور وہ یہ کہ انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر ہونے چاہئیں یا جماعتی بنیادوں (پارٹی سسٹم) پر۔ یہ تو کوئی بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ انتخابات ہوں گے بھی یا نہیں اور اگر ہونگے تو کب (کیونکہ غیب کا علم صرف خدا کو حاصل ہے) لیکن قوم ہے کہ اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ اس پانی کے بلونے میں لگ رہی ہے۔ اگر اس مسئلہ کو سیاسی حدود تک رہنے دیا جاتا تو پھر بھی خیر تھی، لیکن (جیسا کہ اس ملک میں ہو رہا ہے) سوال زیرِ بحث یہ آ رہا ہے کہ "اسلام میں سیاسی پارٹیاں جائز ہیں یا نہیں"؟ جو پارٹیاں قلیل التعداد یا کمزور ہیں، ان کا مفاد اسی میں ہے کہ انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر ہوں، اس لئے وہ سارا زور یہ ثابت کرنے میں لگا رہی ہیں کہ اسلام میں سیاسی پارٹیوں کا وجود جائز نہیں کیونکہ اس سے امت میں تفرقہ پیدا ہوتا ہے۔ ان کے برعکس جو پارٹیاں کثیر التعداد، مضبوط، منظم اور صاحبِ وسائل ہیں وہ چاہتی ہیں کہ انتخابات جماعتی بنیادوں پر ہوں۔ اس لئے وہ یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ پارٹی سسٹم عین مطابقِ اسلام ہے۔ حتیٰ کہ وہ یہاں تک کہہ رہی ہیں کہ خود صحابہؓ میں سیاسی پارٹیاں موجود تھیں، اور سیاسی پارٹیوں کا مٹانا خلافِ اسلام ہوگا (ضمناً جب موجودہ حکومت نے سیاسی پارٹیوں کو کالعدم قرار دیا تھا تو ان پارٹیوں میں سے کسی نے یہ کہہ کر اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کی تھی کہ حکومت کا یہ اقدام خلافِ اسلام ہے)۔

طلوعِ اسلام تو شروع سے اس موضوع پر لکھتا چلا آ رہا ہے لیکن آپ بتائیں گے کہ یہ جو

اسلام کے نام پر بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں، انہیں کسطرح بند کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس سے غیر مسلموں کو یہ سمجھنے کا موقعہ مل جاتا ہے کہ یہ کس قسم کا اسلام ہے جس میں ہر مسئلہ کے جائز اور ناجائز ہونے کی تائید مل جاتی ہے؟

طلوعِ اسلام

"بھانت بھانت کی بولیاں بولنے" کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہاں ہر فرقہ، بلکہ ہر شخص کا اسلام الگ الگ ہے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اپنے اسلام کے دعاوی کے لئے کسی سند کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ جو کچھ وہ خود کہہ دیں یا ان کے "مولانا صاحب" فرما دیں، وہ سند ہو جاتا ہے۔ باقی رہے سند پیش کرنے والے، سو ان کے ہاں سندات کا اس قدر انبار ہے کہ اس میں سے ہر بات کی تائید میں سند حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم تو ہمارے ہاں "تقاریب یا تقاریر کی ابتداء میں تلاوت کے لئے مخصوص ہے۔ سند، احادیث یا فقہ کی ہوتی ہے۔ (مولانا حامد میاں کے ارشاد کے مطابق) احادیث کی تعداد دس لاکھ کے قریب ہے۔ اس سے اسناد کی تعداد کا اندازہ آپ خود لگا لیجئے۔ فقہ کے مسائل کی تعداد شاید اس سے بھی زیادہ ہو۔ ایک "فتاوی عالمگیری" ہی کو لیجئے تو وہ اس قدر ضخیم ہے کہ اٹھائے نہ بنے۔ لہٰذا جس قسم کا فتویٰ مطلوب ہو، فقہ سے مل سکتا ہے۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کے ہاں اسلام، ان کی مصلحت کے تابع بدلتا رہتا ہے یعنی جو بات آج خلافِ اسلام ہے، وہ کل کو عین مطابقِ اسلام ہو جاتی ہے۔ یہ اسلام، سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کا وضع فرمودہ ہے۔ اس کی متعدد مثالیں طلوعِ اسلام میں پیش کی جاتی رہی ہیں۔ تجدید یادداشت کے لئے اسی مسئلہ کو لیجئے کہ پارٹی سسٹم اسلام کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے کارفرما تھی۔ مودودی (مرحوم) کو اس کی مخالفت مقصود تھی تو آپ نے فرمایا کہ امتِ مسلمہ، غیر مسلموں کے مقابلہ میں خود ایک پارٹی ہے اس لئے اس کے اندر پارٹیاں بنانا، امت میں تفرقہ پیدا کرنا فلہٰذا خلافِ اسلام ہے۔ دو تین سال بعد انہیں خود اپنی پارٹی بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے جماعتِ اسلامی کی بنیاد رکھی اور پارٹی سازی عین مطابقِ اسلام ہو گئی۔ وہ اپنی اس پارٹی کو ساتھ لئے پاکستان آ گئے۔ انہوں نے اسے اسقدر اہمیت دی کہ جب ۱۹۶۲ء میں "پارٹی ایکٹ" پاس ہوا ہے تو انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور کہا کہ

> سچ پوچھئے تو ملک میں سیاسی جماعت بنانے کا سب سے زیادہ حق اب ہمیں حاصل ہو گیا ہے۔ باقی جماعتیں تو رعائتاً اس امر کی مجاز ہوں گی کہ اپنی الگ تنظیم کر لیں۔
> (نوائے وقت، مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۶۲ء)

مودودی صاحب (مرحوم) کا انداز یہ تھا کہ وہ جب (اپنی مصلحت کے تابع) کوئی فیصلہ کرتے تو اسے اسلامی ثابت کرنے کے لئے یا اس کی تائید میں حضور نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی کوئی مثال پیش کر دیتے (طلوعِ اسلام میں اس کی اکثر مثالیں پیش کی جا چکی ہیں)۔ یہی انداز ان کے جانشین میاں طفیل محمد صاحب نے اختیار کر رکھا ہے۔ وہ جماعتی بنیادوں پہ انتخابات پہ بڑا زور دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ پارٹی سازی اسلام کا تقاضا ہے۔ انہوں نے اپنے ایک خطاب میں پہلے یہ فرمایا کہ:

جو لوگ ملک میں اسلامی نظام کی بات کریں اور دوسری طرف ملک میں جماعتی نظام کو تہس نہس کر دیں۔ ملک میں سیاسی جماعتیں ختم کر دیں، وہ کیسے اسلامی نظام نافذ کر سکتے ہیں۔ (روزنامہ جنگ۔ لاہور مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۸۳ء)

یعنی اسلامی نظام اور سیاسی پارٹیاں لازم و ملزوم ہیں۔ اس کی تائید میں فرمایا:

نبیؐ موجود ہو تو اس کی موجودگی میں اس کی جماعت کو چھوڑ کر دوسری جماعت قائم کرنا درست نہیں۔ لیکن صحابہؓ نے اپنی اپنی جماعتیں بنائیں۔ اس لئے مسلمانوں کے اندر جماعت کو حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (ایضاً)

لیکن مودودی صاحب (مرحوم) اس سے پہلے یہ فرما چکے تھے کہ:

نبی کریمؐ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں تمام مسلمان ایک ہی پارٹی تھے۔

(نوائے وقت ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۸ء

آپ نے غور فرمایا کہ ان حضرات کی مصلحتوں کے تابع، اسلام (بیچارے) کا کیا حلیہ بنتا ہے؟

پارٹی سازی کے سلسلہ میں، ایک اور رُخ کا سامنے لانا بھی ضروری ہے۔ صدر مملکت کا مؤقف یہ ہے کہ اسلام میں پارٹیوں کی اجازت نہیں۔ لیکن انہی کی قائم کردہ وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ کچھ اور ہے۔ اسلام آباد سے شائع ہونے والے انگریزی روزنامہ (MUSLIM) کی ۱۴ دسمبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں ایک خبر شائع ہوئی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ وفاقی شرعی عدالت نے اس درخواست کو مسترد کر دیا ہے جس میں استدعا کی گئی تھی کہ پاکستان میں سیاسی پارٹیوں کے وجود کو غیر اسلامی قرار دیا جائے۔ خبر میں کہا گیا تھا کہ:

عدالت نے اپنے فیصلے میں کہا ہے کہ اسلام کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی سیاست میں پارٹیاں موجود تھیں۔ عدالت نے اپنے فیصلہ کی تائید میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ایک ریسرچ فیلو، محمود احمد غازی کی یہ رائے نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوری بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ[1] کے زیر قیادت انصار دو متمیز گروہوں کی حیثیت سے سامنے آئے اور ثقیفہ بنی سعد میں جمع ہوئے

---

[1] آپ نے غور فرمایا کہ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلہ کی اتھارٹی کیا ہے اور کس قسم کی ہے؟ اسلام کی جو درگت اس دور میں بن رہی ہے شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو؟

آپ نے غور فرمایا کہ ان "بھانت بھانت کی بولیوں" کی وجہ کیا ہے؟ وجہ صرف یہ ہے کہ قوم نے کسی بات کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا کوئی متفقہ معیار اپنے سامنے نہیں رکھا۔ معیار تو ایک ہی تھا یعنی خدا کی کتاب۔ لیکن اسے انہوں نے شجرِ ممنوعہ قرار دے رکھا ہے۔ یہ اس لئے کہ جو حضرات اسلام کا نام اس طرح استعمال کر رہے ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر قرآن کو معیار قرار دے لیا تو صاحبِ ضربِ کلیم کا یہ اژدھا ساحرین کی ان سب رسیوں کو نگل جائے گا۔

مذہبی فرقے:

سیاسی پارٹیوں کو خلافِ اسلام قرار دینے والوں کی دلیل یہ ہے کہ اس سے امت میں تفرقہ پیدا ہوتا ہے لیکن یہ کہتے وقت وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے (یا پسِ پشت ڈال دیتے) ہیں کہ تفرقہ کا بنیادی سبب مذہبی فرقے ہیں، جنہیں قرآن کریم نے بہ نصِ صریح شرک قرار دیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ سے فرمایا تھا کہ جو لوگ فرقوں میں بٹ جائیں آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں رہ سکتا! ان فرقوں کے خلاف کوئی بھی آواز نہیں اٹھاتا۔ اٹھائیں کسطرح؟ وہ تو سب کے سب خود فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ (کالعدم) جماعتِ اسلامی بڑے فخر سے دعوےٰ کرتی رہتی ہے کہ وہ فرقہ بندی سے بلند ہے۔ لیکن فرقہ بندی کی گرہیں جسطرح انہوں نے مضبوط کی ہیں، وہ خود فرقوں کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ ان کی سکیم بڑی دوررس تھی۔ پہلے انہوں نے یہ فارمولا دیا کہ پاکستان کا ضابطہ قوانین کتاب و سنت کی بنیادوں پر مرتب کیا جائے، اور اس کی تائید مختلف فرقوں کے نمائندوں سے حاصل کر لی اور یہ دعوےٰ کر دیا کہ دیکھئے! کس طرح تمام فرقے متفق ہو گئے ہیں، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ نہ یہ فارمولا ممکن العمل ہے۔ نہ ہی مختلف فرقے متفق ہو سکتے ہیں، کیونکہ "سنت" ہر فرقہ کی الگ الگ تھی۔ بیس سال تک انہوں نے قوم کو اس الجھاؤ میں رکھنے کے بعد فرمایا کہ "کتاب و سنت کی بناء پر پبلک لاء کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جو سب فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔" اس کے بعد ان سے پوچھا گیا کہ اب کیا کیا جائے تو فرمایا کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کر دی جائے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ یہ بھی ممکن العمل نہیں کیونکہ اسے وہ خود اس سے قبل "منجمد شاستر" قرار دے چکے تھے۔ اور یہ بھی کہ مختلف فرقے اس پر بھی متفق نہیں ہو سکیں گے۔ اس کا جو نتیجہ مرتب ہو رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ حدود کے سلسلہ میں فقہی قوانین نافذ ہوئے ہیں تو ان کے متعلق خود صدرِ مملکت بار بار فرما چکے ہیں کہ ان پر عمل نہیں ہو رہا۔ ان کے علاوہ پبلک لاز کی حیثیت سے دو ہی قوانین اب تک نافذ ہوئے ہیں۔ یعنی زکوٰۃ اور عشر سے متعلق۔ اور دونوں کے متعلق حکومت کو یہ ترمیم کرنی پڑی کہ ان پر ہر فرقہ "اپنی اپنی فقہ کے مطابق" عمل کر سکتا ہے۔ یعنی پبلک لاز کو پرسنل لاز میں تبدیل کرنا پڑا۔ علاوہ اس بات کے کہ پبلک لاز اور پرسنل لاز کی تفریق خود غیر اسلامی ہے، اربابِ سیاست اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ مملکتیں پبلک لاز کے ضابطہ کی بنیادوں پر قائم رہا کرتی ہیں۔

واضح رہے کہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں فرقوں کا وجود ختم کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں جاری شدہ ایک آرڈیننس کی رو سے انہیں پھر آئین کا جزو بنا دیا گیا ہے۔

ان حالات میں آپ خود غور فرمالیں کہ مملکت پاکستان کس مقام پر کھڑی ہے۔ یہاں اسلام کے نام پر کیا کچھ ہو رہا ہے اور قوم کو کس طرف لے جایا جا رہا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے اس میں (کالعدم) جماعت اسلامی کا کس قدر ہاتھ ہے۔ طلوعِ اسلام اس جماعت کے ساتھ چالیس سال سے ہمدوش چل رہا ہے اور اس کے ہر نقشِ قدم سے واقف ہے۔ اس لئے ہم اپنے تجربہ کی بنا پر یہ کہنے کے قابل ہیں کہ پاکستان میں اسلام کو جس قدر نقصان اس جماعت نے پہنچایا ہے اس کا ازالہ عرصہ دراز تک نہیں ہو سکے گا۔

---

(۲)

اجتہاد

سوال:۔ آپ نے نومبر ۱۹۸۳ء کے طلوعِ اسلام میں، حضرت معاذ بن جبل کے سلسلہ میں جو نکتہ بیان کیا ہے اس نے نگاہ کا زاویہ بدل دیا ہے۔ لیکن اس قدر اہم موضوع پر آپ نے بڑے اختصار سے لکھا ہے اس کے متعلق قدرے تفصیل سے لکھئے۔

جواب:۔ اگر آپ ایک اصولی نکتہ کو ذہن نشین کر لیں تو کسی تفصیل کی ضرورت نہیں رہے گی۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ دین کے احکام اور اصول اسلامی مملکت کے لئے ہیں۔ اگر انہیں اسلامی مملکت کے فریم میں رکھا جائے تو ہر جزئیہ اپنی اپنی جگہ فٹ بیٹھ جاتا ہے اور ان کے سمجھنے میں کوئی الجھاؤ پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر مملکت اسلامی نہ ہو تو دین کی کوئی شق بھی اس کے فریم میں فٹ نہیں بیٹھتی اور ان کے سمجھنے میں الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ غیر اسلامی مملکت میں اسلام دین نہیں رہتا۔ مذہب بن جاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ دین کا لبادہ، جسدِ مذہب پر راست آ نہیں سکتا۔ ہماری موجودہ مشکل اور وجہ پریشانی یہ ہے کہ مملکت غیر اسلامی ہے اور ہم اس میں دین کی جزئیات فٹ کرنا چاہتے ہیں۔ اور جب وہ فٹ نہیں بیٹھتیں تو ہم ان پر رندہ چلانا شروع کر دیتے ہیں۔

اسی مسئلہ اجتہاد کو لیجئے۔ اسلامی مملکت کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ قرآن کے احکام و اصول کو نافذ کرے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ان کی تنفیذ کے لئے طور طریقے وضع کئے جائیں۔ یہ طریقے امت کی مشاورت سے وضع کئے جائیں گے۔ اسے اجتہاد کہا جائے گا۔ اس اجتہاد کے نتیجہ میں امت جس نتیجہ پر پہنچے گی، اسے قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کیا جائیگا۔ یہ قوانین شریعت کہلائیں گے۔ ان میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت محسوس ہوگی تو مملکت پھر ان پر امت کے مشورے سے غور و فکر کریگی۔ اس تمام پروگرام میں کسی فرد یا گروہ کے اجتہاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ حتیٰ کہ مقامی افسر بھی اس کے مجاز نہیں ہوں گے کہ اگر کسی معاملہ میں حکومت کا فیصلہ موجود نہیں تو وہ اپنے طور پر (ذاتی اجتہاد سے)

فیصلہ کرکے اسے قانون کی حیثیت سے نافذ کر دیں، انہیں ایسے معاملات کو مرکزی حکومت کی طرف (REFER) کرنا ہوگا اور وہاں سے جو فیصلہ موصول ہو، اسے نافذ کرنا ہوگا۔ قرآن کی یہی راہنمائی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ دین کے اس فریم میں مسئلہ اجتہاد کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جائے تو اسلام کا سارا نقشہ بدل جاتا ہے۔ اس میں امّت کی اجتماعیت ختم ہو جاتی ہے اور اسلام نام رہ جاتا ہے انفرادی مذہب کا۔ آپ پاکستان پر غور کیجئے اس کی مملکت اسلامی نہیں اس میں اسلام مختلف فرقوں کا اختیار کردہ انفرادی مذہب ہے۔ ہر فرقہ اصولاً اس کا مدعی ہے کہ اس کے ہاں زندگی کے تمام تقاضوں کے لئے ضروری احکام موجود ہیں۔ اس لئے اجتہاد کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن زمانے کے تقاضے ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں جن میں وہ بھی مجبور ہو جاتے ہیں کہ جدید احکام شریعت وضع کریں۔ اس کے لئے اجتہاد کیا جاتا ہے اور اس انفرادی اجتہاد کے لئے اس قسم کے سوال اٹھتے ہیں کہ مجتہد کی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں۔ اجتہاد کے لئے شرائط کس قسم کی ہونی چاہئیں وغیرہ وغیرہ۔ ان خصوصیات اور شرائط پر بھی سب کا اتفاق نہیں ہوتا۔ پھر مجتہد جو اجتہاد کرتا ہے اس کے اجتہاد کی حیثیت انفرادی ہوتی ہے کہ جس کا جی چاہے اسے مانے جی چاہے نہ مانے۔ اگر حکومت اس کے اجتہاد کو قبول کرے، اس کے مطابق کوئی قانون نافذ کر دیتی ہے تو اس کی حیثیت بھی اسلامی قانون کی نہیں ہو سکتی۔ اسلامی قانون تو وہی قرار پا سکتا ہے جسے اسلامی مملکت نافذ کرے۔ (مثلاً) اگر بھارت کی حکومت شراب کو ممنوع قرار دینے کے لئے کوئی قانون نافذ کر دے تو امتناع شراب ہر چند اسلام کے منشا کے مطابق ہوگا لیکن اس قانون کو اسلامی قانون شریعت نہیں کہا جا سکے گا۔ اس لئے کہ وہ قانون اسلامی مملکت کی طرف سے نافذ نہیں ہوا۔ اسلامی مملکت وہی کہلا سکتی ہے جس کا تمام کاروبار قرآن کریم کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔

اس سے آپ سمجھ لیجئے کہ غیر اسلامی مملکت یا معاشرہ میں اجتہاد کی حیثیت کیا ہوتی ہے۔ اس میں نہ اجتہاد، اسلامی اجتہاد ہوتا ہے، نہ اس اجتہاد کا ماحصل اسلامی قانون۔ اسلامی اجتہاد، اسلامی مملکت کے مشاورتی فیصلوں کا دوسرا نام ہے جو قرآن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کئے جائیں۔

عورت کے حقوق:

پاکستان میں عورت کے مقام اور حقوق کے سوال پر کچھ عرصہ تک گرما گرم بحث ہوتی رہی اور اس کے بعد اسے (حسب معمول) برف خانہ میں ڈال دیا گیا۔ کہا جا رہا ہے کہ قانون شہادت اور دیت اور قصاص سے متعلق قوانین کے مسودات زیر غور ہیں (نظر آتا ہے کہ) اس سلسلہ میں عورت کی حیثیت کے متعلق سوال پھر بحث و نظر کا موضوع بنے گا۔ فروعات سے قطع نظر کیا کوئی بنیادی اصول

ایسا ہے جس کی رو سے یہ واضح ہو جائے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے، مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق مراتب نہیں؟

جواب: بنیادی اصول ہے۔ اور ایسا ہے جس سے کسی کو بھی مجالِ انکار نہیں ہو سکتی۔ اور وہ اصول ہے مساواتِ انسانیہ۔ یعنی پیدائش کی رُو سے، انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ سب کو یکساں حقوق حاصل ہوتے ہیں اور سب یکساں واجب التکریم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ کسی انسانی بچے کو اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ کون سے گھرانے میں پیدا ہو گا یہ اس کے انتخاب کی بات نہیں ہوتی۔ اس میں اس کے (CHOICE) کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ اس باب میں مجبور رہتا ہے۔ اور قرآن کا اصول یہ ہے کہ جس بات میں کوئی شخص مجبور ہو، وہ بات اس کے خلاف نہیں جا سکتی۔ اسی اصول کی بناء پر اس نے سب سے پہلے نسبی اور نسلی امتیاز و افتخار کو ختم کیا اور پیدائش کے اعتبار سے ہر انسان کو ایک سطح پر کھڑا کر دیا۔

ہندوؤں کے ہاں ورنوں (ذات پات کی تقسیم) کا عقیدہ ہے یعنی برہمن کھشتری۔ ویش اور شودر۔ جو بچہ جس گھر میں پیدا ہو جائے اس کے مطابق معاشرہ میں اس کا مقام متعین ہو جاتا ہے، اور یہ مقام ناقابلِ تغیر ہوتا ہے۔ یعنی شودر بچے کو نہ اس کا اختیار تھا کہ وہ شودروں کے سوا کسی اور گھرانے (مثلاً برہمن کھشتری گھرانے) میں پیدا ہو جاتا۔ اور نہ اب اس کا اختیار کہ وہ اپنے ورن (ذات) کو بدل لے۔

ہم اسی نکتہ پر ہندو دھرم کو باطل اور اس کے "برہما" کو ظالم قرار دیتے ہیں[1]۔ یہودیوں کے ہاں عقیدہ ہے کہ بنی اسرائیل چاہیتی اولاد ہیں اور اصرف بنی اسرائیل ہونے کی بناء پر / جنت کی مالک۔ غیر بنی اسرائیل (یعنی جو شخص یہودیوں کے ہاں پیدا نہ ہوا ہو) خدا کے ہاں مغضوب ہیں اور جنت میں قدم تک نہیں رکھ سکتے۔ قرآن کریم قدم قدم پر ان کے اس نسلی امتیاز کے عقیدہ کو باطل قرار دیتا ہے۔ اصول وہی ہے کہ جو بات انسان کے اپنے بس کی نہیں وہ اس کے لئے وجہِ تفریق کیوں ہو؟

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، اپنی پیدائش کے ساتھ، اپنے اوّلیں ماں باپ (آدم حوا) کے گناہ کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے دنیا میں آتا ہے، اور اگر وہ اسے حضرت مسیحؑ کے کفارہ کے عقیدہ کی بناء پر اتار نہیں پھینکتا تو اس کی نجات نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم نے اس عقیدہ کی بھی سختی سے تردید کی اور کہا کہ جو بات انسانی بچہ کے بس کی نہیں، وہ اس کے لئے کسی قسم کی سزا کا موجب کسطرح ہو سکتی ہے۔

---

[1] برہما (یا خدا) ایسا نہیں کرتا یہ اونچی ذات والوں کا پیدا کردہ عقیدہ ہے۔

لہٰذا، قرآن کی رُو سے بنیادی اصول یہ ہے کہ پیدائش کی رُو سے انسان اور انسان میں فرق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں اسے کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

اب اس اصول کو آگے بڑھائیے؟ قرآنِ کریم عورت اور مرد دونوں کو "انسان" قرار دیتا ہے اس نے جہاں جہاں "الناس" کا ذکر کیا ہے اس سے مراد نوع انسان (عورت اور مرد دونوں) ہیں۔ لہٰذا جو مقام، یا حقوق، الناس (نوع انسان) کو حاصل ہیں، وہ مردوں اور عورتوں دونوں کو یکساں حاصل ہیں۔ پیدائش کی رُو سے ان میں فرق کرنا، قرآن کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ لڑکی (عورت) اپنی مرضی سے لڑکی نہیں بنتی۔ اسے خدا ایسا بناتا ہے۔ نہ ہی لڑکا اپنی مرضی سے لڑکا بنتا ہے۔ دونوں اس باب میں مجبور ہوتے ہیں۔ لہٰذا، لڑکے (مرد) کو محض مرد ہونے کی بناء پر (جس میں اس کی کسی کاریگری کو دخل نہیں ہوتا) افضل قرار دینا اور لڑکی (عورت) کو محض عورت ہونے کی وجہ سے (جس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہوتا) کم تر درجے پر رکھنا وہی تفریق ہے جو شودر اور برہمن میں روا رکھی جاتی ہے۔ ہم شودر اور برہمن میں تفریق پیدا کرنے والے دھرم کو باطل، اور ان کے برہما کو ظالم قرار دیتے ہیں، لیکن دو انسانوں (مرد اور عورت) میں تفریق کو (بزعم خویش) اس اسلام کا تقاضا قرار دیتے ہیں جو خدا کا تجویز فرمودہ دین ہے اور کبھی نہیں سوچتے کہ اس سے اسلام، اور خود خدا کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے!

ہم جب ذمہ دار ارباب دانش و اقتدار کو (جو مرد ہوتے ہیں) یہ کہتے سنتے ہیں کہ ہم طے کریں گے کہ عورتوں کو کیا حقوق ملنے چاہئیں تو ہمیں اس پر ہنسی بھی آتی ہے اور بیحد صدمہ بھی ہوتا ہے۔ ان، بر خود غلط انسانوں سے کوئی پوچھے کہ آپ کو یہ خدائی اختیارات کسطرح حاصل ہو گئے ہیں کہ آپ اپنے ہی جیسے انسانوں کے حقوق متعین کرنے بیٹھ جائیں۔ انسانوں کے حقوق متعین کرنا اختیاراتِ خداوندی میں شامل ہے۔ مردوں کا (عورتوں کے حقوق متعین کرنے کے اختیار کا) جذبہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کارخانے کا مالک یہ طے کرے کہ مزدوروں کی اجرت اور دیگر مراعات کیا ہونی چاہئیں۔ اصل یہ ہے کہ عورتوں کے حقوق مقرر کرنے کا جذبہ، ہمارے موروثی ملوکیت اور نظامِ سرمایہ داری کے زمانے کا پیدا کردہ ہے جس میں پیدائشی فرق، شودر اور برہمن کی سی تفریق پیدا کر دیتا ہے۔ عورتوں کو مردوں کا دست نگر بنا کر اسی مقام پر پہنچا دیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے موؤدہ (یعنی اس بچی کے متعلق جسے زندہ دفن کر دیا جاتا تھا) یہ کہا تھا کہ وہ قیامت میں پوچھے گی کہ بای ذنب قتلت، "مجھے کس جرم کی پاداش میں قتل کیا گیا تھا"؟ لیکن ہمارے معاشرہ میں ہر عورت دامن پکڑ کر پوچھتی ہے کہ بای ذنب قتلت۔ اور اس اضافہ کے ساتھ پوچھتی ہے کہ ایام جاہلیت کی موؤدہ ہم سے پھر بھی اچھی تھی کہ اسے ایک ہی بار ختم کر دیا جاتا تھا، ہمارے مقدر میں سسک سسک کر مرنا ہے۔ یہاں ہر لحظہ موت آتی ہے، پر نہیں آتی۔ یہاں پر عورت پکار پکار کر کہتی ہے کہ،

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جسطرح ۔ ہم نے تمام عمر گذاری ہے اس طرح!

حقائق و عبر

(۱) کیا احمدی مسلمان ہیں :-

ہم نے طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۱۹۸۳ء میں "کیا احمدی مسلمان ہیں" کے عنوان سے ایک مستند تحریر کیا تھا جسے بغرضِ تجدید یادداشت درج ذیل کیا جاتا ہے :-

"ملتِ اسلامیہ ہندیہ کی سو سالہ کوششوں کے بعد، مملکتِ پاکستان نے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے کر اس کانٹے کو جسدِ امت سے الگ کیا لیکن اسی امت میں (بدقسمتی سے) ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں احمدیوں کا غیر مسلم قرار دیا بڑا ناگوار گزر رہا ہے اور وہ کسی نہ کسی بہانے انہیں "مسلمانوں" کے زمرے میں شامل کرنے کی سعیِ مذموم کرتے رہتے ہیں۔ اس کی تازہ مثال (کالعدم) جماعتِ اسلامی کے نمائندہ ماہنامہ ترجمان القرآن میں ملتی ہے۔ اس نے اپنی اگست ۱۹۸۳ء کی اشاعت کے ادارہ (اشارات) میں یہ بحث چھیڑی ہے کہ زکوٰۃ فنڈ کے سلسلہ میں اگر وسعتِ ظرف سے کام لیا جائے تو اس سے مستثنیٰ رہنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ یہ نکتہ ذرا لطیف سا ہے اس لئے اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ زکوٰۃ آرڈیننس کا اطلاق غیر مسلموں پر نہیں ہوتا وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

۲۔ اس کا اطلاق مسلمانوں پر ہوتا ہے لیکن ان میں سے جو شخص اپنے آپ کو شیعہ کہہ دے، وہ اس سے استثنیٰ حاصل کر سکتا ہے۔

یعنی غیر مسلم اس آرڈیننس سے مستثنیٰ ہیں۔ انہیں استثنیٰ حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جو مسلمان اس سے مستثنیٰ رہنا چاہیں انہیں استثنیٰ حاصل کرنی ہوگی۔

اس صراحت کے بعد دیکھئے کہ ترجمان القرآن اس باب میں کیا لکھتا ہے۔ اس نے لکھا ہے :-

اس سے یہ راستہ بالکل بند ہو جاتا ہے کہ کوئی قادیانی کہہ کر استثنیٰ حاصل کر لے، کوئی شخص کی پابندی کی وجہ سے الگ ہو جائے اور غیر مسلم عناصر تو ہیں ہی الگ۔

اس سے واضح ہے کہ ترجمان القرآن کے نزدیک قادیانی، مسلمان ہیں جن پر زکوٰۃ آرڈیننس کا اطلاق ہوتا ہے

اور انہیں اشیعوں کی طرح) اپنے آپ کو قادیانی لکھ کر استثنیٰ حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ غیر مسلم ہوتے تو انہیں استثنیٰ حاصل کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی کیونکہ "غیر مسلم عناصر ہیں ہی الگ"!

"ختم نبوت" کو جزو ایمان ماننے والوں کے لئے یہ امر گہرے غور و تدبر کا مقتضی ہے کہ یہ حضرات چپکے ہی چپکے کس سازش کے درپے ہیں؟ اگر کسی ایک احمدی (قادیانی یا لاہوری) نے زکوٰۃ آرڈی ننس سے استثنیٰ حاصل کر لی تو ان کا یہ دعویٰ مسلّم ہو جائے گا کہ حکومت انہیں مسلمان تسلیم کرتی ہے۔ ہم زکوٰۃ سے متعلق ارباب حکومت سے بھی گذارش کریں گے کہ وہ غیر مبہم الفاظ میں واضح کریں کہ کیا "احمدی" زکوٰۃ آرڈی ننس سے استثنیٰ حاصل کرنے کی درخواست دے رہے ہیں اگر ایسا ہے تو حکومت کی طرف سے انہیں کیا جواب دیا جاتا ہے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے"۔

مدیر ترجمان القرآن نے اپنے مجلہ کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۸۳ میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے:۔

وضاحت اور ترمیم

اگست کے اشارات میں صفحہ ۲۸۳ کے نیچے سے گنیں تو سطر ۵، ۶ کی عبارت کے متعلق دو ایک اصحاب کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ راقم قادیانیوں کو مسلمانوں کا ایک فرقہ سمجھتا ہے۔

یہ بات مجھے تسلیم ہے کہ جملے کی ترتیب میں کمزوری ہے، کیونکہ میں نے بستر علالت پر یہ مضمون لکھا تھا اور ادھر پرچے کے لیٹ ہونے کی وجہ سے بہت جلدی بھی تھی بہر حال اب میں وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ میں قادیانیوں کو خارج از اسلام سمجھتا ہوں، اس سلسلے میں نظم و نثر میں میرے قلم سے کئی چیزیں لکھی گئی ہیں، نیز ۱۹۵۳ء میں میں نے اسی وجہ سے نظر بندی کا دور گذارا۔

متذکرہ دو سطری عبارت کو نئی شکل یوں دی جا سکتی ہے:۔

"اس طرح یہ راستہ بالکل بند ہو جاتا ہے کہ کوئی شخص کے فقہی مسلک کی وجہ سے الگ ہو جائے اور کوئی غیر مسلم ہونے کی بناء پر استثنیٰ حاصل کر لے"۔

بادنیٰ تدبر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ مدیر ترجمان القرآن کی یہ وضاحت، عذر گناہ بدتر از گناہ کے مترادف ہے۔ ہمارا اعتراض یہ تھا کہ زکوٰۃ آرڈیننس کا اطلاق صرف مسلمانوں پر ہوتا ہے۔ غیر مسلموں پر ہوتا ہی نہیں۔ اس لئے غیر مسلموں کا اس سے استثنا (EXEMPTION) حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ اگر کسی کے متعلق کہیں گے کہ وہ اس سے اس طرح استثنا

حاصل کر سکتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ اسے مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ مدیر ترجمان القرآن نے اپنی سابقہ عبارت کو جو نئی شکل دی ہے اس پر غور فرمایئے۔ لیعنی :-

اس طرح یہ راستہ بالکل بند ہو جاتا ہے کہ کوئی شخص کسی فقہی مسلک کی وجہ سے الگ ہو جائے اور کوئی غیر مسلم ہونے کی بناء پر استثنیٰ حاصل کر لے۔

ظاہر ہے کہ یا تو یہ صاحب سمجھ ہی نہیں رہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، اور اگر یہ تجاہل عارفانہ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ احمدیوں کے مسلمان تسلیم کئے جانے کے امکان کا دروازہ کم از کم کھڑکی کھلی رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کسی احمدی کو زکوٰۃ آرڈیننس سے مستثنیٰ قرار دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کسطرح دوسرے ہی دن عدالت کا دروازہ یہ کہکر نہیں کھٹکھٹا تا کہ حکومت نے مجھے مسلمان تسلیم کر لیا ہے۔ جبھی تو مجھے اس آرڈیننس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے جس کا اطلاق مسلمانوں پر ہوتا ہے جس طرح شیعوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ اگر حکومت مجھے غیر مسلم سمجھتی تو مجھ سے کہہ دیتی کہ اس آرڈیننس کا اطلاق غیر مسلموں پر ہوتا ہی نہیں۔ اور چونکہ تم غیر مسلم ہو اس لئے تمہارے حق میں استثنیٰ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہم ایک بار پھر حکومت کی توجہ اسطرف منعطف کرانا چاہتے ہیں کہ "سادگی و پرکاری" کے لباس میں پوشیدہ، اس فتنے کا دروازہ بند کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

۲۔ فرقہ وارانہ اختلافات:-

مذہبی راہنماؤں سے جب کہیئے کہ آپ میں اسقدر فرقہ وارانہ اختلافات ہیں تو ان کی موجودگی میں آپ میں باہمی اتحاد اور امت میں وحدت کیسے پیدا ہو سکے گی، تو اس کے جواب میں یہ حضرات نہایت سادگی سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ اختلافات فروعی اور جزئی ہیں۔ ان سے ہمارے اتحاد پہ کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ہم ان کے اس دعویٰ کی تردید میں مسلسل لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اب ایک تازہ شہادت ملاحظہ فرمائیے۔

ہفتہ وار جریدہ الاعتصام (لاہور) فرقہ اہل حدیث کا ترجمان ہے۔ ان دنوں اس میں اہلحدیث اور حنفیوں کے اختلافات کے سلسلہ میں مسلسل بحث چل رہی ہے۔ اس کی (۱۲) اگست ۱۹۸۳ء کی اشاعت کے دو ایک اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔ اہلحدیث مولوی صاحب، حنفی مخالف کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:-

خواہ مخواہ آپ نے اتنا طول دیا۔ سیدھی سادھی بات یہ تھی کہ آپ شروع ہی میں دو ٹوک کہہ دیتے کہ ہمارے اور اہلحدیث کے درمیان نظریاتی فرق ہیں۔ جناب میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ فروعی مسائل کی وجہ سے فرقہ بندی نہیں ہوتی بلکہ فرقہ بندی کے لئے نظریاتی اختلاف ضروری ہے۔ پس صحابہ اور تابعین کے بعد جتنے بھی فرقے

وجود پذیر ہوئے وہ سب نظریاتی اختلاف کی وجہ سے ہی ہوئے ہیں اور صرف اہلحدیث ہی وہ جماعت ہے جس نے ہمیشہ ان نظریاتی فرقوں سے علیحدہ رہ کر صرف سنت رسولؐ اور طریقہ خلفائے راشدین اور روشِ صحابہ پر گامزن ہے (صفحہ)

ذرا آگے چل کر اس اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:۔

در اصل اہلحدیث اور دوسرے فرقوں کے درمیان جو اختلاف ہے وہ یہی نظریاتی اختلاف ہے۔ دوسرے فرقے اس نظریے سے جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو پیش کیا تھا اس سے آہستہ آہستہ الگ ہوگئے اور اس سیدھے سادے طریقۂ نبویہ پر قانع نہ رہ سکے بلکہ ہر ایک طریقے میں لم تلاش کرنا شروع کر دی اور اس تلاش نے ان کو الفاظ کے گورکھ دھندوں میں پھنسا کر عمل سے دور کر دیا۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ہدایت فرمائی کہ صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ" (کما رواہ البخاری)۔ یعنی "تم نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھ رہے ہو" فقہاء خصوصاً فقہائے عراق اس پر قانع نہ رہ سکے بلکہ نماز کے ایک ایک جزو کو الگ الگ کیا اور اپنی سمجھ کے مطابق ہر ایک کی حیثیت مقرر کی کہ یہ فرض ہے، وہ واجب ہے، فلاں سنت ہے اور یہ مستحب ہے۔ ان کو چھوڑ دینے کے باوجود نماز مکمل ہو جائے گی۔ مثلاً کسی نے صرف رکوع میں سر جھکا دیا، اگرچہ اطمینان اختیار نہ کیا اور رکوع کی تسبیحات بھی نہیں پڑھیں تو بھی رکوع ہو گیا کیونکہ لغوی معنی جھکنا پا لیے گئے۔ گویا یہ تقسیم کر کے نماز کی اصل ہئیتِ نبویہؐ کو بگاڑنے کی کوشش کی گئی۔ اہلحدیثوں نے اس تقسیم کو صرف یہی نہیں کہ قبول نہیں کیا بلکہ ہر زمانے میں غلط کہا۔ اسی طرح دین کے سارے احکام کے ساتھ تلعّب کی شکل اختیار کی گئی۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عید سے قبل قربانی سے منع فرمایا، فقہائے عراق نے حیلہ نکالا کہ جانور دیہات میں بھیج کر نمازِ عید سے پہلے قربانی کرا لو وغیرہ۔ اور ان ہی باتوں کو فقہ کے نام سے عوام میں پھیلایا گیا۔ اب کوئی انصاف سے فیصلہ کرے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی ہئیت خود اپنے قول و فعل سے مقرر فرما کر اس کی تاکید فرما دی کہ رب العالمین کو ایسی ہی نماز مطلوب ہے، اگر بہ بلائے نسیان و ذہول یا عدم استطاعت کوتاہی ہو گئی تو کوئی حرج نہیں لیکن جان بوجھ کر کسی رکن کو چھوڑ دینا کہ یہ مستحب ہے یا ..... یا ...... تو پھر وہ نماز کس طرح قبول ہوگی؟

یہ وہ نظریاتی اختلافات ہیں، آپ جن کو غلط تصور کرتے ہیں لیکن دلیل کچھ بھی نہیں بلکہ عوام کے جذبات سے کھیلنے کے لئے شعبدہ بازی سے کام لیا ہے۔ آپ اپنی حیثیت پہچانیے۔ کل قیامت میں کیا جواب دیں گے۔

یہ ہے ان حضرات کے باہمی اختلافات کی حقیقت! یعنی یہ اختلاف فروعی نہیں، نظری ہیں جن میں کبھی توافق پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے باوجود یہ اسی کی رٹ لگاتے جائیں گے کہ ہمارے اختلافات فروعی ہیں۔ نظریاتی نہیں اور اسی لئے ہمارے فرقے، فرقے نہیں مکاتبِ فکر ہیں! معلوم نہیں اس سے یہ حضرات کسے دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۲/۹)

۳۔ ایران میں اسلامی تعلیم:-

مجلہ ڈان (کراچی) کی ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں لندن کے جریدہ سنڈے ٹائمز میں شائع شدہ ایک شذرہ شائع ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ایران میں اسلامی تعلیم کے کوائف کیا ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:-

قریب چار سال کا عرصہ ہوا، ایران کی دو سو یونیورسٹیاں اور اعلیٰ تعلیمی ادارے انقلابی حکومت نے بند کر دیئے تھے۔ اب وہاں، تہران یونیورسٹی میں، ایسی تراجم کر کے جو (امام) آیت اللہ خمینی کے فنڈامینٹلسٹ اسلام کے تقاضوں کو پورا کر سکیں، اسے دوبارہ کھولا گیا ہے۔ جریدہ سنڈے ٹائمز کے نامہ نگار، آمر (یا عامر یا امیر AMIR) طاہری کی رپورٹ کے مطابق قدیم سٹاف میں سے پانچ فیصد کو نکال دیا گیا ہے۔ سابقہ (۲۳،۰۰۰) طلباء کے مقابلہ میں اب اس میں صرف (۴،۰۰۰) طلباء ہیں۔ ان میں پہلے (۴۳) فیصد لڑکیاں تھیں۔ اب ان کی تعداد دس فیصد رہ گئی ہے۔ سٹاف میں سے تمام عورتوں کو خارج کر دیا گیا ہے۔ کلاس روم کو ایک پردے کے ذریعے الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے جن میں ایک طرف لڑکے بیٹھتے ہیں دوسری طرف لڑکیاں (دکھائی دینا تو ایک طرف ان کی آواز بھی سنائی نہیں دی جا سکتی۔ وہ پس از پردہ صرف لکھ کر سوال پوچھ سکتی ہیں۔ لڑکیوں کا لڑکوں کے ساتھ بات چیت کرنا ایسا جرم ہے جس کی سزا قید ہے۔ اس کے لئے سرکاری نگہبان موقعہ پہ موجود رہتے ہیں (کہ ان احکام کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے)۔ (لڑکے) طالب علموں کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ "عورتیں کمزور بھی ہوتی ہیں اور خطرناک بھی اور خدا پرست انسانوں کو وحشی (WILD) بنا دینے کا موجب۔ اس لئے انہیں (عورتوں) کو کنٹرول میں رکھنا، خود ان کے حق میں بہتر ہے۔

سابقہ نصاب کی کتابوں کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا ہے کہ وہ صیہونیت اور استعمار کی علامات ہیں۔ اور جدید نصاب کی کتابیں بتایا نہیں گئیں (طلباء کو بتایا جاتا ہے کہ) "نیوٹن، ڈارون، آئن سٹائن، فرائڈ اور مارکس، ان خطرناک صیہونی ایجنٹوں میں سے ہیں جو انبیاء کرام کی صداقتوں

کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کر کے، خدائے حقیقی پر ایمان کو تباہ کر دیتے ہیں!"..... پہلے سال کے طلباء کو (امام) خمینی کی تعبیر کے مطابق اسلام کی تعلیم دی جائیگی جس کے لئے تم کے دینیات کے اساتذہ لیکچر دیں گے..... اس (اسلام) میں، جانوروں کو اسلامی طریق سے ذبح کرنے اور مچھلیاں پکڑنے کے علاوہ (زرعی شعبہ سے متعلق طلباء کو) بارش برسانے کی دعاؤں، اچھی فصل اگانے کے لئے مذہبی رسومات کی ادائیگی اور ٹڈی دل وغیرہ کے نقصانات سے محفوظ رہنے کے وظائف (PSALMS) کی تعلیم دی جائے گی۔

فنڈامینٹل ازم:

قارئین اس اصطلاح سے بخوبی متعارف ہیں۔ امریکہ نے مسلمانوں کے مختلف ممالک میں جدید تحریکات کا جائزہ لینے کے بعد کہا تھا کہ مسلمانوں میں اسلام کے متعلق جو جدید رجحانات پیدا ہو رہے ہیں وہ "اسلام کے لئے" خطرناک ہیں۔ ان کی روک تھام کے لئے ضروری ہے کہ ان میں اس خیال کو عام کیا جائے کہ حقیقی اسلام وہی ہے جو مسلمانوں میں رائج چلا آ رہا ہے اور جسے ان کی مذہبی پیشوائیت پیش کرتی ہے۔ اس تحریک کو فنڈامینٹل ازم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اسے کامیاب بنانے کے لئے جسقدر بے تحاشا روپیہ صرف کیا جا رہا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ (مسلمانوں کے بعد اسے یہودی اور عیسائی ممالک میں بھی رائج کیا گیا ہے) یہ تحریک بظاہر مذہبی اور معصوم سی نظر آتی ہے لیکن (استعمار پسند سرمایہ دار مملکتوں کی ہر تحریک کی طرح) اس کے سیاسی مضمرات بڑے دور رس ہیں۔ اس کا (سب سے پہلا) نتیجہ یہ ہے کہ ان ممالک میں نظام سرمایہ داری کی جڑیں مضبوط ہو رہی ہیں۔ اس لئے کہ مذہب کوئی بھی ہو، وہ نظام ملوکیت (انسانوں کی حکمرانی) اور سرمایہ داری کا مؤید ہوتا ہے۔ یہ تحریکیں اگرچہ مسلمانوں کے مختلف ممالک میں پھیلی ہوئی ہیں لیکن ان میں اب باہمی ربط پیدا کیا جا رہا ہے۔ امریکہ سے شائع ہونے والے جریدہ "ٹائم" (TIME) کی ۳۰ مئی ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں ایک بڑا معلومات افزا مقالہ شائع ہوا ہے جس میں مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کا سیاسی جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے:-

> مسلمانوں کی فنڈامینٹل اسٹ تحریک۔ یعنی وہ طوفانی قوت جس نے ایران میں انقلاب برپا کر دیا تھا، اب اپنی قوت کی نمود، مصر، اردن، شام، سعودی عرب، اور خلیج کی امارات میں بھی کر رہی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے مسائل کے ایکسپرٹ یہ اندازے لگا رہے ہیں کہ اگر ان نصف درجن ممالک میں اس تحریک کے حامیوں نے متحدہ محاذ بنا لیا تو نہ معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو!

ان میں آپ پاکستان میں فنڈامینٹل ازم کا اضافہ کر لیجئے اور پھر سوچئے کہ اقوام مغرب "احیاء اسلام" کے پردے میں مسلمانوں سے کیا کچھ کرانے کے منصوبے باندھ رہی ہیں۔ یہ سب منصوبے اس لئے ہیں کہ ــــ ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں! مسلمان کہیں قرآن کی طرف نہ آجائے۔ یعنی اس قرآن کی طرف جو سرمایہ داری اور استعماریت، سیکولرازم سب کا خاتمہ کر دیتا ہے

جذباتی ردِ عمل کی انتہا:۔

عورتوں پر مردوں کا استبداد، اقوام مشرق ہی کی خصوصیت نہیں، مغرب بھی اس باب میں پیچھے نہیں رہا تھا۔ لیکن وہاں عورتوں نے کافی عرصہ پہلے اس کے خلاف احتجاج شروع کر دیا تھا۔ ایسا ہونا ضروری تھا۔ لیکن چونکہ یہ ردِ عمل جذباتی تھا اس لئے اس میں دلائل و براہین (REASON) کی حدود کا بھی خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ (مثلاً) انگریزی زبان میں نوعِ انسان کے لئے (MAN-KIND) کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس پر عورتوں کی طرف سے یہ اعتراض ہوا کہ (MAN) ہی کیوں۔ اس کے ساتھ (WOMAN) بھی ہونا چاہیئے (یا مثلاً) دنیا کی ہر قوم اور ہر مذہب میں، خدا کو مذکر بولا جاتا ہے۔ اس کے لئے ضمائر اور افعال بھی مذکر ہی کے استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے خلاف بھی آواز اٹھائی گئی لیکن زبان دان اس مشکل کا حل نہیں سوچ سکے کہ اگر خدا کے لئے مثلاً (HE) نہ کہا جائے تو (SHE) کہا جائے گا۔ اس پر مردوں کی طرف سے یہ اعتراض اٹھے گا۔ وہ ابھی اس فکر میں تھے کہ زبان میں کچھ ایسی ترمیم کی جائے جس میں خدا کے لئے ایسے الفاظ وضع کئے جائیں جو مذکر اور مؤنث دونوں کو محیط ہوں، کہ اس سوال نے مذہبی شکل اختیار کر لی۔ وہ کسطرح؟ اسے آپ اس خبر سے سمجھ سکیں گے جو جریدہ جنگ (لاہور) کی ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے ملاحظہ فرمائیے اور محظوظ ہو جیئے:۔

واشنگٹن (جنگ رپورٹ) مسیحی عقیدے کے مطابق خدا کو باپ کہا جاتا ہے لیکن دور جدید میں عورتوں نے اس بات پر احتجاج کیا ہے کہ خدا کو صرف مرد کی حیثیت کیوں دی گئی ہے۔ عورتوں کے اس نقطہ نظر کے مطابق خدا کو ماں کہنا بھی ضروری ہے۔ اس تقاضے کے پیش نظر اب بائبل کے کچھ نئے مفسرین نے لکھا ہے کہ آئندہ مسیحی عقیدہ رکھنے والے لوگ جب خدا کو مخاطب کریں گے تو "اے خدا ہمارے آسمانی باپ" کہنے کی بجائے "اے خدا ہمارے آسمانی ماں اور باپ" کہا جایا کرے گا۔ بائیبل کا یہ نیا ترجمہ اور تفسیر نیشنل کونسل آف چرچز نے ۳۲ پروٹسٹنٹ اور قدامت پسند تنظیموں کی رضامندی سے کیا ہے۔ ان تنظیموں کے چار کروڑ ارکان ہیں۔ اب یہی انجیل "خدا کی کتاب" قرار پا جائیگی۔ چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند!

نظریہ ضرورت کا اسلام :-

جب ۱۹۷۹ء میں مارشل لاء حکومت کی طرف سے "حدود" کے متعلق آرڈیننس جاری ہوا تھا، تو سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے حسبِ ذیل بیان کی رو سے ان کا استقبال کیا تھا جو ان کی جماعت کے ترجمان ہفتہ وار مجلہ ایشیا کی ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا :-

ہزار شکر کہ دیکھے ہیں پھر بہار کے دن

صدرِ مملکت جنرل ضیاء الحق نے عیدِ میلاد النبیؐ کے روز چند اہم اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ کا جو اعلان کیا ہے وہ ان بے شمار نعتوں اور مدحیہ تقریروں سے زیادہ قیمتی ہے جو رسول اکرمؐ کی شان میں کی اور کہی گئی ہیں۔ اس لئے کہ حضورؐ کی محبت کا اصل تقاضا تو آپ کے لائے ہوئے دین کو قائم کرنا اور آپ کے دیئے ہوئے احکام کو نافذ کرنا ہے جس کی نہایت مبارک اور قابلِ تحسین ابتدا صدر پاکستان کے اس اعلان سے ہوئی ہے۔ یہ پاکستان کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ اپنے جس مقصدِ وجود سے وہ ۳۲ سال محروم رہا اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ اس کی راہ پر گامزن ہو رہا ہے۔ تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس ربِ کریم کے شکرگزار ہوں اور اس نعمت کی ناقدری کر کے اس کی رحمت کی بجائے لعنت کے مستحق نہ بنیں۔ اجرائے احکامِ اسلامی کا اعلان ہو جانے کے بعد صدرِ مملکت، ان کی حکومت اور عدلیہ کے حکام اور عام مسلمان سب بڑی آزمائش میں پڑ گئے ہیں۔ انسانی احکام کی خلاف ورزی کرنا اور چیز ہے اور خدا اور رسولؐ کے قانون کو توڑنا بالکل ہی دوسری چیز ہے۔ اس سے تو آدمی کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے اور وہ خدا کے غضب کا مستحق بن جاتا ہے ضرورت ہے کہ ہر شخص اپنے دائرہ عمل میں اس عظیم ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کرے۔ اور سب سے زیادہ حکومت کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے افسروں اور ملازمین کو تمام ممکن وسائل سے کام لیکر اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے قابل بنانے کی کوشش کرے۔

آپ اس بیان کو بار بار پڑھیئے کہ مارشل لاء کے نافذ کردہ ان احکام کے تقدس کے متعلق کیا کہا گیا ہے۔ اس کے بعد دیکھئے کہ (اب) مودودی (مرحوم) کے جانشین پروفیسر غفور احمد (نائب امیر کالعدم جماعت اسلامی) کیا فرماتے ہیں۔ پچھلے دنوں انہوں نے لاہور ہائیکورٹ اور ڈسٹرکٹ بار کے ایک مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا :-

مارشل لاء اسلام کی ضد ہے۔ مارشل لاء کے ذریعے اسلام نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ (روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۸/۱۱/۸۳)

یعنی اس مارشل لاء کے نافذ کردہ احکام کے متعلق اس وقت کیا کہا گیا تھا اور اب کیا کہا جا رہا ہے؟ وہ بھی اسلام تھا اور یہ بھی اسلام ہے۔ مرحوم اپنی جماعت کے لئے ایسی گنجائشیں پیدا کر گئے ہیں کہ وہ جو جی میں آئے کریں اور جو جی میں آئے کہیں۔ انہیں کسی قسم کی جھجک ہی نہ ہو۔ نظریہ ضرورت کا اسلام اسی کو کہتے ہیں۔

باسمہ تعالیٰ

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے؟

★

آج کل ہمیں بکثرت اس قسم کے استفسارات موصول ہو رہے ہیں جن میں کہا جاتا ہے:۔

آپ ان موضوعات پر بڑی کثرت سے لکھتے رہتے ہیں کہ اسلامی مملکت کس قسم کی ہوتی ہے۔ اسلامی نظام سے کیا مراد ہے۔ اسلامی قوانین کسطرح مرتب ہونگے اور یہ کہ اسلام کے مطابق زندگی اسلامی مملکت ہی میں بسر ہو سکتی ہے۔ چونکہ آج کل اسلامی مملکت کہیں بھی قائم نہیں اس لئے اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ہم انفرادی طور پر اپنے اندر کسی قسم کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ براہِ کرم یہ بھی بتائیے کہ بحالاتِ موجودہ ہم اپنی زندگی میں ایسی تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں جس سے اسلام کی تھوڑی بہت جھلک نظر آسکے؟

ہم اس موضوع پر جستہ جستہ لکھتے ہی رہتے ہیں لیکن جامع طور پر ہم نے چار سال پہلے پرویز صاحب کا ایک جامع مقالہ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا ـــــ مومن کی زندگی ـــــ بتقاضائے حالات ہم اسے دوبارہ شائع کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ اسلامی مملکت بھی انہی افراد کے ہاتھوں قائم ہو سکے گی جو مومنانہ خصوصیات کے حامل ہوں۔ رسول اللہؐ نے پہلے (مکی زندگی میں) اس قسم کے افراد پیدا کئے تھے پھر اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی تھی۔ معاشرہ، قوم، مملکت، افراد ہی سے عبارت ہوتے ہیں۔ جس قسم کے افراد اسی قسم کے یہ ادارے! فرد اور ملت کا باہمی تعلق قرآن کے نظامِ اجتماعی کا بنیادی اصول ہے۔

اس نقطہ نگاہ سے بھی اس مقالہ کو بغور پڑھنے کی ضرورت ہے۔

مومن کی زندگی

(قرآن کے آئینے میں)

پرویز

قرآن کریم کی تعلیم، انسان کو کیا بنا دیتی ہے؟ اس کی تفصیل میں جائیے تو کئی مجلدات درکار ہوں گی لیکن اگر اسے اجمالی طور پر بیان کرنا چاہیں تو اس سے بہتر، جامع اور حسین انداز میں کچھ اور نہیں کہا جا سکتا جسے علامہ اقبالؒ نے اس ایک مصرعہ میں سمو دیا ہے کہ

آنچہ حق می خواہد، آں سازد ترا

قرآن کی تعلیم انسان کو وہ کچھ بنا دیتی ہے جو کچھ خدا چاہتا ہے کہ یہ بن جائے۔ یعنی جس مقصد کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے، وہ مقصد پورا ہو جائے۔ اس کے سفرِ حیات کے لئے، جو منزل مقرر کی گئی ہے، یہ اس منزلِ منتہیٰ تک پہنچ جائے۔ انسان اور دیگر حیوانات کی تخلیق میں ایک بنیادی فرق ہے۔ دُنیا کے ہر حیوان نے جو کچھ بننا ہوتا ہے

انسان اور حیوان میں فرق

وہ ازخود وہ کچھ بن جاتا ہے۔ اس کے لئے اسے نہ کسی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، نہ سعی و کاوش کی حاجت۔ فطرت نے اس کے اندر جو کچھ بننے کے امکانات رکھے ہیں، وہ امکانات ازخود بتدریج مشہود ہوتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ ایک عمر تک پہنچ کر، وہ حیوانی بچہ، اپنی نوع کا مکمل فرد بن جاتا ہے ـــــ شیر کا بچہ شیر بن جاتا ہے۔ بکری کا بچہ بکری۔ لیکن انسانی بچے میں فطرت نے جو مضمر صلاحیتیں رکھی ہوتی ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حیوانی یا طبیعی صلاحیتیں۔ یہ دیگر حیوانات کی طرح ازخود نشوونما پاکر، ایک منتہیٰ تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور وہ بچہ بالآخر آدمی بن جاتا ہے۔ دوسری صلاحیتیں انسانی ہیں۔ یہ ازخود نشوونما نہیں پاتیں۔ انہیں مناسب تعلیم و تربیت سے نشوونما دے کر اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ قرآن کریم وہ پروگرام دیتا ہے جس سے فرد کی وہ مضمر صلاحیتیں پوری پوری نشوونما پاکر مشہود ہو جاتی ہیں اور پھر وہ انہیں ان مقاصد کے لئے صرف کرتا ہے جو اس کے لئے متعین کئے گئے ہیں۔ جب وہ اس مقام پر پہنچ جائے گا کہ انسان وہ کچھ بن گیا جو کچھ بننا اس کے لئے مقصود و مطلوب تھا۔ قرآن نے ایسے فرد کو مردِ مومن کہہ کر پکارا ہے اور انسان کی اس ہیئت کو احسن تقویم قرار دیا ہے (۹۵/۴)۔ یعنی ایسی ہیئت جو حسن و توازن میں انتہا تک پہنچ

مومن

گئی ہو۔ جن خصوصیات کے مظہر یہ افراد ہوں انہیں صفاتِ مومنین کہا جاتا ہے۔ اور جب یہ خصوصیات محسوس شکل میں سامنے آئیں تو انہیں اعمالِ صالح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی ایسے کام جو اس فرد کی بھرپور انسانی

صلاحیتوں کے اثمار و نتائج ہوں اور جن سے عالمِ انسانیت کے بگڑے ہوئے معاملات سنور جائیں۔ جو معاشرہ ایسے افراد پر مشتمل ہو، اسے قرآن نے خَیْرَ اُمَّۃٍ (۳/۱۱۰) "بہترین قوم جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے" قرار دیا ہے اور اُمَّۃً وَّسَطًا (۲/۱۴۳) "یعنی ایسی قوم جسے عالمِ انسانیت میں مرکزی حیثیت حاصل ہو" کا مقام دیا ہے۔ سطحی نظر سے دیکھئے تو معاشرہ، جماعت یا اُمّت، افراد ہی کے مجموعہ کا نام ہوتی ہے۔ لیکن اجتماعی نفسیات پر نگاہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ جماعت، افراد کی حاصل جمع (SUM TOTAL) کا نام نہیں ہوتی۔ اس کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اس لئے قرآن، افراد کی خصوصیات کے علاوہ۔ جماعتِ مومنین کی خصوصیات کا ذکر بھی خاص

اُمّت کی خصوصیات

طور پر کرتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ وہ افراد کی تعلیم۔ تربیت اور نشوونما کے علاوہ، ان اصول و ضوابط کی بھی وضاحت کرتا ہے جن کے مطابق ان افراد نے اجتماعی امور سرانجام دینے ہوتے ہیں اور جن کی بناء پر وہ ایک منفرد جماعت بنتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں قرآنی تعلیم کی انفرادیت اور بے مثالیت نکھر کر سامنے آتی ہے اور اسی مقام کے سامنے نہ ہونے سے اچھے اچھے سمجھدار لوگوں کو بھی یہ دھوکا لگ جاتا ہے کہ "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں[1]"۔ "عالمگیر سچائیوں" سے ان کی مراد ہوتی ہے عام اخلاقی اصول ـــــ مثلاً جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ کسی کو ستاؤ نہیں۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہی اخلاقی اصول قرآن پیش کرتا ہے اور یہی تعلیم دُنیا کے دیگر مذاہب میں بھی پائی جاتی ہے تو وہ پکار اٹھتے ہیں کہ "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں"۔ لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ جس اجتماعی نظام میں ان اخلاقی اصولوں کے حامل افراد زندگی بسر کرتے ہیں، اس نظام کے

نظام اور فرد

اصول کیا ہیں۔ مثال کے طور پر سمجھئے کہ ایک برہمن جھوٹ نہیں بولتا۔ چوری نہیں کرتا۔ انسان تو ایک طرف، کیڑوں مکوڑوں تک کو بھی نہیں ستاتا۔ لیکن جس اجتماعی نظام کا وہ فرد ہے اس کا اصول یہ ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے انسان اور انسان میں اس قدر گہرا اور بنیادی فرق ہوتا ہے کہ برہمن کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ ساری عمر دوسروں سے اپنی پرستش کراتا ہے اور شودر کے ہاں جنم لینے والا بچہ، تمام عمر، دوسروں کی خدمت اور بیگار میں بسر کر دیتا ہے۔ اور یہ فرق اس قدر غیر متبدل ہوتا ہے کہ شودر کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کے جوہر ذاتی اور اس کی ہزار محنت اور کوشش اس فرق کو مٹا نہیں سکتی۔ آپ کہئے کہ جو معاشرہ اس اجتماعی اصول کے مطابق متشکل ہو، اس میں افراد کی اس قسم کی "نیکیاں" کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے اور چوری نہیں کرتے، کیا خوشگوار نتائج پیدا کر سکتی ہیں؟ افراد کی اس قسم کی "نیکیاں" محدود سے انفرادی حلقہ میں قدرے سکون پیدا کر سکتی ہیں۔ لیکن نہ تو یہ انسان کو اس کا صحیح مقام دینے کے قابل بن سکتی ہیں اور نہ ہی عالمگیر انسانیت کی فوز و فلاح کا موجب۔ حتیٰ کہ یہ اُس باطل نظام کو تباہی سے بچا سکنے کے قابل بھی نہیں ہو سکتیں جس کے اندر وہ "نیک انسان" زندگی بسر کرتا ہے۔ یا مثلاً جس معاشرہ کا اصول یہ ہو کہ جو بچہ بنی اسرائیل (یہودیوں) کے ہاں پیدا نہ ہو، وہ نجات و سعادت حاصل نہیں کر سکتا۔ اس معاشرہ میں افراد کی اس قسم کی نیکیاں کہ وہ جھوٹ نہیں

---

[1] ترجمان القرآن۔ ابوالکلام آزاد مرحوم۔

بولتے اور چوری نہیں کرتے۔ عالمِ انسانیت کے کس کام آسکتی ہیں؟ یا جس معاشرہ میں عقیدہ یہ ہو کہ ہر انسانی بچہ پیدائشی طور پر گنہگار پیدا ہوتا ہے اور اس کے گناہوں کا یہ داغ، "خدا کے بیٹے" (حضرت مسیحؑ) کے کفارہ پر ایمان سے ہی دھل سکتا ہے۔ اس کے سوا، اس داغ کے مٹنے کی کوئی صورت نہیں، اس معاشرہ میں لوگوں کا رحمدل حلیم الطبع اور منکسر المزاج ہونا، شرفِ انسانیت کی دلیل کیسے بن سکتا ہے؟ دنیائے مذاہب سے الگ ہٹ کر دیکھئے اور سوچئے کہ کیا نظامِ ملوکیت میں، ایک بادشاہ کے لئے، جو کروڑوں انسانوں پر اپنی مرضی چلاتا ہے، یہ بات موجبِ فخر قرار پا سکتی ہے کہ اس نے ساری عمر تہجد قضا نہیں کی یا شراب نہیں پی؟ نظامِ سرمایہ داری میں، اگر ایک جاگیردار۔ زمیندار یا کارخانہ دار، جو ہزاروں محنت کش غریبوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سمیٹ کر لے جاتا ہے، یہ کہتا ہے کہ اس نے کبھی چوری نہیں کی، تو کیا اُسے نیک انسان کہا جا سکتا ہے؟ اگر ایک مذہبی پیشوا، جو دن رات عوام کو اس قسم کے عقائد کی تعلیم دیتا رہتا ہے کہ امیری اور غریبی انسان کی تقدیر سے وابستہ ہے جسے خود خدا نے مقرر کیا ہے اور خدا کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا، اور اس کے ساتھ کہتا ہے کہ اس نے ساری عمر جھوٹ نہیں بولا، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کی یہ انفرادی نیکی، انسانیت کی اجتماعی میزان میں کوئی وزن رکھے گی؟ ان مثالوں سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جن انفرادی اخلاقی خوبیوں کو "عالمگیر سچائیاں" کہہ کر اسلام کو مذاہبِ عالم کی صف میں ہم دوش کھڑا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، غلط اجتماعی نظام میں ان کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟ اصل یہ ہے کہ مذہب اور دین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مذہب، انفرادی ضابطہ اخلاق کا علمبردار ہوتا ہے اجتماعی نظام سے اسے سروکار نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس، دین، اجتماعی نظامِ انسانیت کو سامنے رکھتا ہے اور افراد کی اخلاقی خوبیوں کو اس لئے ضروری قرار دیتا ہے کہ اس سے اس معاشرہ کا توازن قائم رہے جو عالمگیر انسانیت کی سلامتی اور ارتقاء کا ضامن ہے، اور یوں انسان وہ کچھ بن جائے جو کچھ بن سکنے کا اس میں امکان ہے۔

باطل کا نظام اور انفرادی نیکیاں

قرآن کی جامع تعلیم

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ

(۱) جس معاشرہ میں افراد، عام اخلاقی ضوابط کی پابندی نہیں کرتے، اس معاشرہ میں کسی کو امن اور سکون نصیب نہیں ہو سکتا اور خود معاشرہ کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔

(۲) جس معاشرہ میں افراد عام اخلاقی ضوابط کے پابند ہوں، لیکن خود معاشرہ، غلط اجتماعی اصولوں پر متشکل ہو، اس میں عام معاشرتی روابط میں تو قدرے سکون حاصل ہو سکتا ہے لیکن نہ تو اس معاشرہ کی بنیادیں مستحکم ہوتی ہیں، اور نہ ہی اس کا وجود عالمگیر انسانیت کے لئے موجبِ رحمت بن سکتا ہے۔ اور

(۳) جس معاشرہ میں افراد، عام اخلاقی ضوابط کے پابند ہوں، اور خود معاشرہ بھی صحیح اجتماعی اصولوں کا علمبردار ہو، اس میں، افرادِ معاشرہ کو حقیقی امن و سکون میسر ہوتا ہے۔ ان کی طبیعی اور انسانی صلاحیتیں نشوونما پا کر برومند ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور اس کا وجود عالمگیر انسانیت کے لئے موجبِ فلاح و سعادت ہوتا ہے۔

قرآن کریم اسی قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے، جس میں افرادِ معاشرہ عام اخلاقی اصولوں کے شدت کے ساتھ پابند ہوں، اور جو معاشرہ ان افراد پر مشتمل ہو، وہ ان مستقل اقدار کا حامل ہو جو عالمگیر انسانیت کو

اس کی منزلِ مقصود تک لے جاتے۔ اور یہ ہے قرآن کا وہ نظام جس کی مثال کسی اور جگہ نہیں مل سکتی۔ قرآنی تعلیم اپنی اس خصوصیتِ کبریٰ کی بناء پر بے مثل و منفرد ہے۔ قرآن میں مومنین کی ان انفرادی اور اجتماعی خصوصیات کا ذکر اس تفصیل، کثرت اور تکرار سے آیا ہے کہ اس سے افراد کی سیرت و کردار کا صحیح نقشہ اور جماعتِ مومنین (اسلامی معاشرہ) کا بیّن اور واضح تصور سامنے آجاتا ہے۔ اکثر مقامات پر ان انفرادی اور اجتماعی خصوصیات کا ذکر الگ الگ آیا ہے لیکن بعض مقامات پر ایک دوسرے میں یوں سموئی ہوئی سامنے آتی ہیں۔ جیسے ایک حسین وشاداب شجرِ طیّب کہ اگر اس کی شاخوں، پتیوں، پھولوں اور شگوفوں کو الگ الگ بھی دیکھا جائے تو پورے کا پورا درخت باعثِ شادابیٔ قلب و نظر ہو جائے اور اگر اس سرسبز و شاداب درخت پر بہ ہیئت مجموعی نگاہ ڈالی جائے تو اس کی تمام پھول پتیوں کی نزہت و لطافت وجہِ نشاطِ روح بن جائے۔ آئندہ سطور میں، ان افراد کی بعض نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے جنہیں قرآن مومن کہہ کر پکارتا ہے۔ اس مقصد کے لئے کہ ہم ان خصوصیات کی روشنی میں، اپنی سیرت و کردار پر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ وہ کس حد تک ان کے آئینہ دار ہیں۔ اس لئے کہ جس طرح عرقِ گلاب اُسے کہا جائے گا جس میں گلاب کی خوشبو اور خصوصیات ہوں۔ اگر اس میں یہ صفات نہ ہوں تو وہ عرقِ گلاب نہیں ہوگا، پانی کا پانی ہوگا، خواہ اس بوتل پر کیسے ہی خوبصورت لیبل پر سنہرے حروف میں "عرقِ گلاب" لکھا ہو۔ اسی طرح مومن وہ کہلائے گا جو مومن کی صفات کا حامل ہو۔ یہی وہ معیار ہے جس پر ہم اپنے مومن ہونے کے دعوے کو پرکھ سکتے ہیں۔ اور ان صفات کے تذکرہ سے یہی مقصود ہے۔

تمسخر نہ اڑاؤ

سب سے پہلے معاشرہ کے روزمرہ کے معاملات اور روابط کو لیجئے اور دیکھئے کہ قرآنِ کریم ان امور کو بھی کس قدر اہمیت دیتا ہے جنہیں عام طور پر قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا لیکن جن سے معاشرہ میں بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ جماعتِ مومنین سے تاکید کرتا ہے کہ

لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ (۴۹/۱۱)

کوئی جماعت، دوسری جماعت کا تمسخر نہ اڑائے

آپ جانتے ہیں کہ تمسخر، جسے ہمارے ہاں بڑا (LIGHTLY) لیا جاتا ہے، کتنے بڑے فساد کا موجب بن جاتا ہے۔ تمسخر درحقیقت ایک گہری نفسیاتی کیفیت کا مظاہرہ ہوتا ہے جو نفرت، حسد، اور انتقام کے جذبات کی پیداکردہ ہوتی ہے لیکن اس شخص میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ ان جذبات کا اظہار کھلے بندوں کرے۔ وہ انہیں تمسخر کے فریب کارانہ پردوں میں چھپا کر پیش کرتا ہے۔ تمسخر کے تیر و نشتر کی شکل وہ ہوتی ہے جسے کسی کا "نام رکھنا" کہتے ہیں۔ قرآن نے یہ کہہ کر اس سے بھی روک دیا کہ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (۴۹/۱۱)۔ ایک دوسرے کے بُرے بُرے نام مت رکھا کرو۔

(۲) اس کے بعد ہے

وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ (۴۹/۱۱)

اور آپس میں ایک دوسرے پر الزام مت لگاؤ۔

الزام تراشی الزام تراشی کس قدر سنگین جرم ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قرآن کی رُو سے زنا کی سزا سو کوڑے ہے اور پاک دامن عورتوں کے خلاف الزام تراشی کی سزا اسی کوڑے۔ ہوتا یہ ہے کہ دوسرے پر الزام لگانے والا، خود تو معتبر بن جاتا ہے اور فریقِ مقابل کو خواہ مخواہ ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتا ہے کہ وہ اپنی برئیت ثابت کرے۔ اس سے اور کچھ نہیں تو اکثر لوگوں کے دل میں اس شخص کے خلاف بدظنی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بھائی! بالآخر کچھ نہ کچھ بات تو ہو گی ہی جس کی بنا پر یہ الزام لگایا گیا ہے!

تا نہ باشد چیزکے گویند مردم چیزہا

بدظنی سے بچو قرآن کریم نے ایک طرف الزام تراشی اور بہتان بازی کی اس قدر سخت سزا مقرر کی، اور دوسری طرف جماعتِ مومنین سے تاکید کی۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (۴۹/۱۲)۔

اے جماعت مومنین! بدظنی سے بہت زیادہ بچو۔ یاد رکھو! بعض بدظنی بدترین گناہ تک پہنچ جاتی ہے۔

اسلامی معاشرہ کے افراد کے دلوں میں ایک دوسرے کے متعلق ہمیشہ خیر سگالی کے جذبات ہونے چاہئیں۔ لیکن جس دل میں کسی کے متعلق بدظنی پیدا ہو جاتی ہے، اس میں خیر سگالی کے جذبات باقی نہیں رہتے۔ اس کا علاج قرآن نے یہ بتایا ہے کہ (۱) ہر شخص کے متعلق تمہارا پہلا ردِّ عمل (FIRST REACTION) نیک ہونا چاہیئے۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَیْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا۔ (۴/۹۴) جو تمہیں سلام کہے اس کے متعلق، یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو۔ اگرچہ یہ آیت، جنگ کے سلسلہ میں ایک اور اہم اصول کی وضاحت کرتی ہے لیکن جب اس کا اطلاق عام معاشرتی روابط پر کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہی ہو گا کہ (تحقیق سے پہلے) تمہارا پہلا ردِّ عمل، ہمیشہ نیک ہونا چاہیئے۔ قرآن کے اسی حکم پر مبنی عدل کا یہ اہم اصول قائم ہوتا ہے کہ جب تک کسی کے خلاف جرم ثابت نہ ہو جائے اسے بے گناہ سمجھنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں اس نے کہا کہ جب کوئی شخص، تم سے کسی کے خلاف کوئی بات کہے تو تمہارا پہلا ردِّ عمل یہ ہونا چاہیئے کہ هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِیْنٌ (۲۴/۱۲) یہ صریح جھوٹ ہے۔ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ (۲۴/۱۶)۔ یہ بہت بڑا بہتان ہے۔

مومن کا پہلا ردِّ عمل

اپنے دل میں ردِّ عمل یہ پیدا کرو، اور پھر اس بات کا چرچا مت کرو۔ (۲۴/۱۵)۔ اگر بات ایسی ہے کہ وہ بالبداہت غلط نظر آتی ہے تو اس کے متعلق خواہ مخواہ کی کرید مت کرو۔

تحقیق کرو وَلَا تَجَسَّسُوْا (۴۹/۱۲) لیکن اگر اس کے متعلق کسی حتمی نتیجہ تک پہنچنا ضروری ہے تو اس کی تحقیق کرو۔ اس تحقیق کے متعلق قرآن نے خصوصیت سے کہا ہے کہ

وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝ (۱۷/۳۶)

جس معاملہ کی تم خود تحقیق نہ کرو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو! تمہاری سماعت۔ بصارت۔ قلب (دماغ۔ آنکھ اور دل) ہر ایک سے پوچھا جائے گا (کہ آیا تم نے ان سے کام لے کر اس معاملہ

کی تحقیق کر لی تھی یا نہیں)۔

اور اگر معاملہ ایسا ہے جس کا اثر جماعتی زندگی پر بھی پڑتا ہے تو اسے متعلقہ حکام تک پہنچاؤ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (۴/۸۳) تاکہ وہ تحقیق کر کے بات کی تہ تک پہنچ جائیں (نیز ۴۹/۶)۔ اسی سلسلہ میں قرآن کریم نے یہ کہا ہے

غیبت مت کرو

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا (۴۹/۱۲)۔ تم ایک دوسرے کی غیبت مت کرو۔ کسی کی پیٹھ پیچھے اس کے خلاف کوئی بات نہ کرو۔ جو بات کہنی ہو اس کے سامنے کہو۔ اگر آپ سے کوئی شخص، کسی کی غیر حاضری میں، اس کے خلاف کوئی بات کہتا ہے تو آپ کا فریضہ ہے کہ اس سے کہہ کر چلو! یہ بات اس شخص کے سامنے چل کر کرو۔ آپ دیکھیں گے کہ اس سے آپ کتنے بڑے فساد کا دروازہ بند کر دیتے ہیں۔

اذیت مت پہنچاؤ

کسی کے خلاف جھوٹے الزام لگانے، یا اس کی غیبت کرنے سے اسے جس قدر قلبی اذیت پہنچ سکتی ہے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ مومن ایک دوسرے کے لئے قلبی سکون اور مسرت کا موجب ہونے چاہئیں، نہ کہ باعثِ اذیت و کوفت۔ اسی لئے فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ (۳۳/۵۸)۔

جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو بلا جرم و خطا، ناحق اذیت پہنچاتے ہیں، تو وہ بہتان تراشی کے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں اور کھلے ہوئے گناہ کا کام کرتے ہیں۔

اس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (۴/۱۴۸)۔ اللہ اسے بھی پسند نہیں کرتا کہ تم خواہ مخواہ کسی بات کی تشہیر کرتے پھرو۔ ہاں مگر جو مظلوم ہو اسے اس کی اجازت ہے کہ وہ اپنے ظلم کے مداوا کے لئے داد فریاد کرے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم روزمرہ کی زندگی سے متعلق ان چھوٹی چھوٹی احتیاطی تدابیر سے، کس طرح ایسی خرابیوں کا سدِ باب کر دیتا ہے، جو معاشرہ میں بہت بڑے فتنہ اور فساد کا موجب بن جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم، ان بظاہر معمولی سی تدابیر پر عمل کرنا شروع کر دیں تو معاشرہ میں کس قدر امن اور سکون پیدا ہو جائے! لیکن قرآن، ان چیزوں پر بھی محض میکانکی طور پر عمل نہیں کراتا۔ وہ افراد کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ جس سے یہ تمام باتیں ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جماعتِ مومنین کے جنتی

دل کا شفاف ہونا

معاشرہ کے متعلق کہا ہے کہ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (۷/۴۳) ان کے دل میں کوئی ایسی بات نہیں رہے گی جسے وہ دوسروں سے چھپا کر رکھنا چاہیں۔ آپ غور کیجئے کہ وہ معاشرہ فی الواقعہ کس قدر جنتی ہو گا جس میں افرادِ معاشرہ کے دل اس قدر آئینے کی طرح صاف اور شفاف ہوں کہ ان میں غبار اور کدورت کا نشان تک نہ ہو اور ہر ایک کا ظاہر و باطن یکساں طور پر سب کے سامنے

ہو۔ اسی کو قرآن نے "دلوں میں باہمی اُلفت پیدا کرنے" سے تعبیر کیا ہے اور جماعتِ مومنین کو جس نعمتِ خداوندی کی یاد دلائی ہے وہ یہی باہمی اُلفت ہے۔ چنانچہ اس جماعت کو مخاطب کر کے کہا گیا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً۔ تم خدا کی اس نعمتِ کبریٰ کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ۔ خدا نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی اُلفت ڈال دی۔ اُلفت، اس قسم کے تعلق کو

اُلفت اور اخوّت

کہتے ہیں جس میں ایک دوسرے کے دل یوں باہم گدغم ہو جائیں جس طرح بادل کا ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے کے اندر ضم ہو جاتا ہے — تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگرے — اس باہمی اُلفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا۔ تم اس نوازشِ خداوندی سے، ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے۔ وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا۔ تم (اس سے پہلے) جہنم کے گڑھے کے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ بس اس میں گرنے ہی والے تھے کہ خدا نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (۳/۱۰۳) اس طرح اللہ اپنے احکام کو واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تم جان لو کہ زندگی کا صحیح راستہ کون سا ہے۔ یہ "باہمی اُلفت" ایسی گراں بہا متاع اور نایاب جنس تھی، کہ نبی اکرمؐ سے کہا گیا — کہ اگر تو چاہتا کہ ساری دُنیا کی دولت خرچ کر کے، ان کے دلوں میں ایسی اُلفت پیدا کر دے، تو بھی ایسا نہ ہو سکتا (۸/۶۳)۔ یہ متاع، باہر سے خرید کر دلوں میں داخل نہیں کی جا سکتی۔ یہ تو دلوں کے اندر تبدیلی سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی یہ نتیجہ ہوتی ہے قرآن کے ساتھ وابستگی کا۔ اسی لئے، اسے قائم رکھنے کے لئے فرمایا کہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (۳/۱۰۳)۔ خدا کی اس رسّی کو سب

اعتصام بحبل اللہ

مل کر مضبوطی سے تھامے رہو اور تفرقہ مت پیدا کرو۔ یہی وہ رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے کے بعد کہا کہ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (۴۹/۱۰)۔ مومن ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔ بھائی بھی ایسے جن کی کیفیت یہ ہے کہ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹)۔ آپس میں ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمگسار۔ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ (۵/۵۴)۔ ایک دوسرے کے سامنے جھکے ہوئے — ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم — لیکن اس نرمی کے یہ معنی نہیں کہ کوئی غلط کام کرے تو اُسے روکا ٹوکا

بُرائی سے روکو

بھی نہ جائے۔ قرآن کریم نے یہودیوں کی تباہی کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ (۵/۷۹) وہ ایک دوسرے کو بُری باتوں سے روکتے نہیں تھے۔ جب جماعتِ مومنین کا عام فریضہ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے (۳/۱۰۴، ۷/۱۵۷، ۹/۷۱)۔ یعنی لوگوں کو ان باتوں کے کرنے کا حکم دینا جنہیں قرآن نے اچھا قرار دیا ہے اور ان امور سے روکنا جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ یہ جماعت، دوسروں کو تو ایسا کہے گی لیکن خود اپنے معاشرے میں یہ کچھ نہیں کرے گی؛ وہ تو سب سے پہلے، ان امور کو خود اپنے ہاں عام کرے گی اور اس کے بعد انہیں دوسروں تک پھیلائے گی۔ اسی لئے جماعتِ مومنین کی خصوصیت یہ بتائی کہ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۹۰/۱۷)۔ وہ ایک دوسرے کو حق (قرآنی احکام و قوانین) کے ساتھ تمسک اور استقامت پذیر رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اور اس طرح باہمی اصلاح کرتے رہتے ہیں — اس لئے کہ وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ (۸/۱) ان کے خدا کا

باہمی صلح کراؤ

ارشاد ہے اور یہ بھی ارشاد ہے کہ اگر سوءِ اتفاق سے ان کی دو جماعتوں میں کہیں لڑائی جھگڑا ہو جائے تو فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا (۴۹/۹) - ان میں باہمی صلح کراؤ - اور اگر ان میں سے کوئی پارٹی سرکشی پر اتر آئے تو اسے اس سے بزور روکو - اور جب وہ اپنی اس روش سے باز آجائے تو ان دونوں میں عدل و انصاف کے مطابق صلح کرا دو -

یہیں سے ہمارے سامنے، ایک اور اہم اصول آتا ہے اور وہ ہے توبہ - ایک شخص کا عام کردار اچھا ہے -

توبہ کا مفہوم

لیکن کسی وقت اس سے نادانستہ کوئی غلط حرکت سرزد ہو جاتی ہے - اس کے بعد اسے اس کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے کئے پر نادم ہوتا ہے - اگر اس کی اس غلط حرکت سے کسی کو اذیت یا نقصان پہنچا ہے تو اس سے معافی مانگتا ہے - اور آئندہ کے لئے اس کی پوری پوری احتیاط برتتا ہے کہ کبھی اس قسم کی حرکت سرزد نہ ہو - اسے قرآن نے تَابَ وَ أَصْلَحَ سے تعبیر کیا ہے - یعنی جس مقام سے نادانستہ غلط قدم اٹھا تھا، اس مقام پر واپس آجانا اور اس کے بعد اپنی ایسی اصلاح کرنا کہ پھر ایسی غلطی نہ ہو - جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ حرکت، نادانستہ - غلطی، سہو اور خطا سے سرزد ہوئی ہو - عمداً ایسا نہ کیا ہو - چنانچہ قرآن کریم نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ (۴/۱۷) - توبہ اسی کی ہے جس سے کوئی غلطی نادانستہ سرزد ہو جائے اور اس کے بعد وہ فوراً اس کی تلافی کر دے - اس میں نادانستہ (بِجَهَالَةٍ) اور فوراً (مِن قَرِيبٍ) کے الفاظ غور طلب ہیں - یہی چیز قرآن کریم نے دیگر مقامات پر بھی بیان کی ہے مثلاً (۱۶/۱۱۹ میں) -

عمداً جرائم

اس کے برعکس، ایک شخص دیدہ دانستہ، عمداً - ارادۃً - غلط حرکات کا ارتکاب کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے - دوسروں کے خلاف جھوٹے الزام لگاتا ہے - غیبت کرتا ہے - وغیرہ وغیرہ - اور جب وہ کہیں گھر جاتا ہے - اپنی مدافعت کی کوئی شکل نہیں دیکھتا، تو کہہ دیتا ہے کہ مجھے معاف کر دو - تو اس کا نام توبہ نہیں - اس کے دیدہ و دانستہ ارتکاب نے یہ واضح کر دیا کہ یہ چیزیں اس کے کردار کا جزو بن چکی ہیں - یونہی نادانستہ سرزد نہیں ہوئیں - اس لئے، جب تک وہ اپنے کردار میں تبدیلی نہیں پیدا کرے گا، ان باتوں سے باز نہیں آسکے گا - وہ توبہ کرنے اور معافی مانگنے کے بعد بھی ایسا کچھ کرتا رہے گا - اسی لئے قرآن نے وضاحت سے کہہ دیا کہ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ (۴/۱۸) - توبہ ان لوگوں کی نہیں ہے جو بری حرکات کرتے رہتے ہیں تا آنکہ جب ان کے سامنے موت آ کھڑی ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ میں توبہ کرتا ہوں ——— "موت کے سامنے آجانے" سے مفہوم یہ ہے کہ جب اسے اس کا یقین ہو جائے کہ جو کچھ اس نے کیا ہے وہ بے نقاب ہو جائے گا اور وہ اس کے مؤاخذہ سے بچ نہیں سکتا تو پھر معافی مانگنے لگ جائے - یہ منافقت اور بدترین کردار کی علامت - یہی وجہ ہے کہ جب فرعون ڈوبنے لگا اور اس نے کہا کہ میں خدا پر ایمان لاتا ہوں تو اس سے کہا گیا کہ اب ایمان سے کیا فائدہ؟ یہ بھی واضح ہے کہ ایسے شخص نے اپنی اس قسم کی

حرکات سے جس شخص کو اذیت یا نقصان پہنچایا ہے، اگر وہ اسے معاف بھی کر دے تو اس سے اتنا ہی ہوگا کہ اس سے کوئی انتقام نہیں لیا جائے گا۔ لیکن اس کی اصلاح تو اسی صورت میں ہو سکے گی جب وہ اپنے کردار میں خود تبدیلی پیدا کرے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے مغربی مفکر نیٹشے نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

جو برائی تم نے میرے ساتھ کی ہے اسے تو میں معاف کر دوں گا۔ لیکن اس سے جو برائی تم نے خود اپنی ذات کے خلاف کی ہے، اسے کون معاف کر سکتا ہے ؟

اب آگے چلئے۔ مردِ مومن اپنے جوہرِ ذاتی، اور بلندیٔ سیرت و کردار کی بناء پر اپنے اندر وزن رکھتا ہے اور یہ وزن ہر مقام پر اس کا توازن برقرار رکھتا ہے۔ لیکن جب انسان میں یہ خوبیاں نہ ہوں اور اس کا ایغو جھوٹی تسکین چاہے تو اس سے اس کے اندر نخوت اور پندار کے غلط جذبات ابھر آتے ہیں جس سے اس میں چھچھورا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن کی تعلیم مردِ مومن میں یہ چیز پیدا نہیں ہونے دیتی۔ چھچھورے پن کا مظاہرہ انسان کی گفتار۔ چال ڈھال سے ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن اس کی تاکید کرتا ہے کہ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا (۱۷/۳۷)۔ زمین پر یوں ہی اکڑ کر نہ چلو۔ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ (۳۱/۱۹) اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کرو۔ اسی طرح وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ (۳۱/۱۹)۔ اپنی آواز بھی نیچی رکھو۔ چلا چلا کر مت بولو۔ بیجا تکبر اور نخوت سے، لوگوں سے ترش روئی سے پیش نہ آؤ۔ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ (۱۸/۳۱) اس لئے کہ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (۳۱/۱۸)۔ خدا، خود پسند، تکبر خور سے انسان کو پسند نہیں کرتا۔ یہ مومنین کی نشانی نہیں ہے۔

چھچھورا پن

نخوت و تکبر

مومن کی صفت یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں سے حسد نہیں کرتا۔ (۴/۵۴) بلکہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے اپنے اندر زیادہ سے زیادہ خوبیاں پیدا ہوں اور اس باب میں وہ دوسروں سے آگے نکل جائے۔ اس لئے کہ اس کے خدا کا حکم ہے کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (۵/۴۸)۔ بھلائی کی باتوں میں ایک دوسرے سے بڑھ جاؤ۔ ان کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ (۲۳/۳)۔ وہ ہر قسم کے لغویات سے پرہیز کرتے ہیں، اور اگر کہیں اتفاق سے اس قسم کی باتیں ان کے سامنے آجائیں تو وہ ان سے دامن بچاتے ہوئے شریفانہ انداز سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا (۲۵/۷۲)۔ ان سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ (۲۲/۳۰)۔ ہر قسم کے مکر و فریب کی ملمع دار باتوں سے اجتناب کرو۔ قُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا (۳۳/۷۰)۔ ہمیشہ صاف سیدھی واضح بحکم، دوٹوک بات کرو۔ يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (۱۷/۵۳)۔ بڑے خوبصورت انداز سے اعتدال کے مطابق۔ اچھی اچھی باتیں کرو۔ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (۲/۴۲)۔ حق اور باطل۔ غلط اور صحیح۔ جھوٹ اور سچ کو آپس میں خلط ملط نہ کرو۔ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ (۲/۴۲)۔ نہ ہی حق کو چھپاؤ۔

حسد نہیں

صاف۔ سیدھی بات کرو

انسان کے اندر ایک بدترین جذبہ ایسا ہے جو اس کی تمام خوبیوں کو تباہ کر دیتا ہے

عزۃ الاثم

اور اسے کبھی صحیح راستے کی طرف آنے نہیں دیتا۔ یہ ہے اس کے ایغو کا جذبۂ پندار یعنی (FALSE PRESTIGE) کا احساس۔ اسے قرآن نے عزۃ الاثم کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ ایک شخص دل میں محسوس کرتا ہے کہ اس نے غلطی کی ہے لیکن اس کے ایغو کا جذبۂ پندار اسے اس کے اعتراف پر آمادہ نہیں ہونے دیتا۔ وہ اس کے لئے اعذار یا وجوہ (JUSTIFICATORY REASONS) وضع کرتا ہے حالانکہ اس کا دل جانتا ہے کہ یہ دلائل جھوٹے اور یہ وجوہات وہمی ہیں' ایسے شخص پر سعادت کی راہیں کبھی نہیں کھل سکتیں۔ یہ چیز پارٹی بازی میں اکثر حق و صداقت کے راستے میں روک بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اپنی پارٹی کا فرد صریحاً غلطی پر ہو، لیکن "پارٹی بازی" کا تقاضا ہے کہ آپ اس کی بہرحال تائید اور مدافعت کریں۔ ایک ڈاکو ہر روز مسافروں کے گلے کاٹے اور غریبوں کو لوٹے۔ اس کی پارٹی کے دوسرے ڈاکو، اسے کبھی بُرا نہیں کہیں گے۔ لیکن اگر وہ لوٹ کے مال میں کچھ خورد برد کرے اور اس کی تقسیم منصفانہ نہ کرے، تو پھر پارٹی والے اسے بے ایمان اور بددیانت قرار دیں گے۔ پارٹی بازی میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ اپنی پارٹی کا آدمی جب تک دوسروں کے خلاف کچھ کرتا رہے اسے کبھی نہیں ٹوکا جاتا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی جاتی ہے۔ اس سے رفتہ رفتہ اس کے دل کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اس میں کسی بات کو (ON MERIT) پرکھنے، اور عدل و انصاف کی رو سے فیصلہ کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ یہ ہے وہ مسخ شدہ ذہنیت جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ۔ جب اس سے کہا جاتا ہے کہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو تو جھوٹی عزت کا احساس اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ (۲/۲۰۶) نتیجہ اس کا یہ کہ اس کی انسانی صلاحیتیں جھلس کر راکھ کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔

مومن، نفس (ایغو) کے اس فریب میں نہیں آتا۔ یہ اس کے راستے میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ دامن جھٹک کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

اب مؤمنین کی مثبت صفات کی طرف آیئے۔ ان کے متعلق سورۃ المؤمنون میں کہا گیا ہے کہ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (۲۳/۸)۔ یہ لوگ امانات کی حفاظت کرتے ہیں اور عہد کی پابندی۔

پابندیٔ عہد

حفظِ امانت کے معنی یہی نہیں کہ جو چیز تمہارے پاس بطور امانت رکھی جائے اسے بحفاظت واپس کر دو۔ یہ وہ بات ہے جسے کسی نے، تم پر بھروسہ کر کے تمہارے سپرد کی ہے وہ امانت میں داخل ہے۔ خواہ وہ اس کا کوئی مال ہو یا اس کی عزت و آبرو کی رکھوالی۔ جہاں تک عہد' معاہدہ کا تعلق ہے' اس کے معنی یہی نہیں کہ جو اقرار نامہ کسی کو لکھ کر دو اس پر قائم رہو۔ اس میں ہر قسم کا وعدہ بھی شامل ہے جو ایک انسان دوسرے سے کرتا ہے۔ یہ بڑی اہم صفت ہے۔ اور اس کی قرآن کریم نے بڑی شدت سے تاکید کی ہے۔ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (۵/۱)۔ میں ہر قسم کا عہد اور وعدہ آجاتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ وعدہ کے معنی کیا ہیں۔ آپ کسی سے کہتے ہیں کہ "بھائی! اس وقت مجھے جانے دو۔ میں ٹھیک چار بجے آجاؤں گا" تو وہ آپ پر اعتماد کر کے آپ کی بات مان لیتا ہے۔ اگر آپ اپنے وعدے کے مطابق آتے نہیں تو آپ اپنا اعتماد کھو دیتے ہیں ـــــ اور یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں بدترین قسم کا معاشرہ وہ ہوتا ہے جس میں کسی کو دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ نہ ہو۔ ایسے معاشرہ میں ہر شخص عدم اطمینان

کے جہنم میں رہتا ہے۔ بعض لوگ تو وعدہ کرتے ہی منافقت سے ہیں۔ یعنی انہوں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا ہوتا ہے کہ انہوں نے وعدہ پورا نہیں کرنا۔ لیکن اکثر جذباتی (یا IMPULSIVE) لوگ، شدتِ جذبات میں آگے بڑھ کر ایک وعدہ کر لیتے ہیں اور اس کے بعد، جب جذبات کی شدت ماند پڑ جاتی ہے تو اس وعدہ سے پھر جانے کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ اس سے جو نقصان دوسروں کو پہنچتا ہے اسے تو چھوڑیئے۔ خود ایسے لوگوں کی سوسائٹی میں کوئی عزت نہیں رہتی۔ مومن کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ وہ وعدہ کرتا ہے تو سوچ سمجھ کر۔ اور جب وعدہ کر لیتا ہے تو پھر کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ اسے پورا کرتا ہے۔

جذباتی لوگ

بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (۳/۷۶)۔ جو اپنے وعدے کو پورا کرتا ہے اور یوں قانونِ خداوندی کی پاسداری کرتا ہے۔ تو یہی لوگ ہیں جو خدا کے نزدیک پسندیدہ اطوار و کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ لہٰذا، وعدہ شکنی، خواہ وہ شروع ہی میں بدنیتی کا نتیجہ ہو۔ یا بعد میں پھر جانے کی وجہ سے، اُس فرد کو ذلیل اور معاشرہ کو تباہ کر دیتی ہے۔ اسی لئے قرآن نے تاکیداً کہا ہے کہ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ۔ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۴) اپنے وعدہ کو ہمیشہ پورا کرو۔ اس کے متعلق تم سے پوچھا جائے گا۔ اور پرسش تو اسی وقت شروع ہو جاتی ہے جب وعدہ خلافی کرنے والے کو ہر نگاہِ حقارت اور نفرت سے دیکھنے لگتی ہے، خواہ وہ بظاہر کتنا ہی معتبر اور معزز کیوں نہ ہو۔

اب آگے بڑھئے۔ قرآنِ کریم نے مؤمنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (۳/۱۸) ہوتے ہیں یعنی ہمیشہ انصاف پر ڈٹ کر کھڑے رہنے والے۔ عدل و انصاف وہ بنیاد ہے، جس پر انسانی سیرت کی عمارت استوار ہوتی ہے اس لئے قرآن کریم اس باب میں مومنین کے سامنے ایسا بلند معیار رکھتا ہے جس پر پورا اترنے سے معاشرہ فی الواقعہ جنت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے — یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ — اے ایمان والو! دنیا میں عدل و انصاف کے علمبردار بن کر رہو۔ اس باب میں کسی جذبے کو اپنے اوپر اثر انداز نہ ہونے دو۔ یہ کچھ خالصتہً لِلّٰہ کرو۔ اس مقصد کے لئے شہادت دینی پڑے تو نہ مدعی کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ نہ مدعا علیہ کی طرف سے۔ بلکہ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ۔ تم خدا کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ۔ اور سچی سچی گواہی دو۔ وَلَوْ عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ — خواہ وہ تمہارے اپنے ہی خلاف کیوں نہ جائے۔ اَوِ الْوَالِدَیْنِ — یا تمہارے والدین کے خلاف جائے۔ وَالْاَقْرَبِیْنَ — یا تمہارے دیگر رشتہ داروں کے خلاف — اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا — وہ دولت مند ہو یا غریب ہو، اس کا بھی تم پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ اس لئے کہ فَاللّٰهُ اَوْلٰی بِهِمَا — اللہ کا حق ان دونوں سے زیادہ ہے۔ اس لئے یاد رکھو۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤی اَنْ تَعْدِلُوْا۔ تم اپنے جذبات کے پیچھے مت چلو۔ اس باب میں، اپنے قلبی رجحانات کو اثر انداز مت ہونے دو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے جذبات تمہیں عدل کرنے سے روک دیں۔ وَاِنْ تَلْوٗۤا — نہ ہی تم کوئی پیچدار۔ ذو معنی بات کرو۔ اَوْ تُعْرِضُوْا — نہ ہی اس سے اعراض برتو۔ پہلوتہی کرو۔ اس لئے کہ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا (۴/۱۳۵)۔ جو کچھ تم کرتے ہو، خدا کو اس کی خبر ہوتی ہے۔ تم اس سے کچھ نہیں چھپا سکتے — یہ ہے عدل کا وہ معیار جو ایک مومن کے لئے مقرر کیا گیا

عدل کے علمبردار

ہے۔ ذرا سوچئے کہ جو معاشرہ ایسے افراد پر مشتمل ہوگا جو اس صفت کے حامل ہوں، اس معاشرہ کی کیفیت کیا ہوگی۔ اس میں یہ نہیں ہوگا کہ اپنی پارٹی کا آدمی ہے تو اس کے لئے میزان اور ہوگی اور دوسری پارٹی کے آدمی کے لئے اور ــــ اس میں، تو دشمن سے بھی عدل کیا جائے گا۔ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا۔ اِعْدِلُوْا۔ (۵/۸)۔ دیکھنا! ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو۔ اُس سے بھی عدل کرو۔ "قُرْبٌ لِلتَّقْوٰى (۵/۸)۔ تقویٰ سے قریب تر روش یہی ہے۔

قانونِ عدل

عدل کے سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس کی ایک شکل وہ ہے، جسے عدالتی عدل کہا جاتا ہے یعنی لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرنا۔ اس کے متعلق قرآن کریم کا حکم ہے کہ إِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (۴/۵۸)۔ جب تم لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو، تو ہمیشہ عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔ عدالتی عدل کے معنی یہ ہیں کہ فیصلہ قانون کے مطابق ہو۔ لیکن قرآن کریم اس باب میں ایک قدم آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر وہ قانون جس کے مطابق فیصلہ کیا جا رہا ہے، خود ہی عدل پر مبنی نہ ہو تو اس کی رُو سے کیا ہوا فیصلہ کس طرح مبنی بر عدل کہلا سکے گا۔ لہٰذا جماعتِ مومنین کے متعلق قرآن کریم میں ہے اُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ (۷/۱۸۱)۔ یہ جماعت "الحق" کے مطابق لوگوں کی راہ نمائی کرتی ہے اور اسی (الحق) کے ساتھ عدل کرتی ہے۔ یعنی ان کے قوانین الحق پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور انہی قوانین کے مطابق یہ لوگوں کے فیصلے کرتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ الحق قرآن کریم ہے کیونکہ خود خدا کا ارشاد ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ۔ (۵/۴۴)۔ جو لوگ معاملات کے فیصلے قرآن کے مطابق نہیں کرتے، سو وہی کافر ہیں۔

واجب حق

عدل کی دوسری شکل یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کا واجب حق ادا کر دیا جائے۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہ کی جائے۔ یہ وہ عدل ہے جو ہر شخص کی زندگی میں قدم قدم پر سامنے آتا ہے اور مومن اس میں ہر مقام پر پورا اترتا ہے۔ آپ سوچئے کہ جس معاشرہ میں ہر شخص کو اس کا حق، بلا کد و کاوش اور بلا پریشانی و کشمکش ملتا چلا جائے، اس میں زندگی کس قدر خوشگوار گزرے گی۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے ایسے جامع الفاظ استعمال کئے ہیں جنہیں پھیلانے سے زندگی کا ہر گوشہ اس کے دائرے کے اندر آجاتا ہے۔ اس نے کہا ہے: وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ (۶/۱۵۲)۔ "ماپ اور تول کو عدل و انصاف کے ساتھ پورا کرو"۔ ماپ اور تول میں ہر قسم کے واجبات آجاتے ہیں۔

احسان

لیکن قرآن کریم عدل سے بھی ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور اس کے ساتھ احسان کا حکم دیتا ہے۔ جیسا کہ اُوپر بتایا گیا ہے، عدل کے معنی ہیں جو کچھ کسی کا واجب ہے وہ ادا کر دینا۔ لیکن اگر اس سے دوسرے کی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو تو قرآن کی تاکید یہ ہے کہ اسے، اس کے واجب سے زیادہ دے کر، اس کی کمی کو پورا کر دیا جائے۔ اسے احسان کہتے ہیں جس کے معنی ہیں کسی کے بگڑتے ہوئے توازن کو برقرار کر دینا اور اس طرح معاشرہ میں حسن پیدا کر دینا۔ اس "احسان" کی ابتدا، اپنے گرد و پیش سے کی جائے گی اور اس میں سرفہرست والدین کا نام آئے گا۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (۴/۳۶)۔ آپ حیوانات پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں

گے کہ وہاں، ماں باپ اپنے بچے کی پرورش تو کرتے ہیں لیکن بچے اپنے والدین کو پوچھتے تک نہیں۔ وہ انہیں جانتے پہچانتے بھی نہیں۔ یہ خصوصیت انسانی زندگی میں آکر پیدا ہوتی ہے کہ جب ماں باپ بوڑھے ہو جائیں تو اولاد ان کی خبر گیری کرے۔ والدین کے بعد دوسرے لوگ بھی اسی زمرے میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے وَبِذِی الْقُرْبٰی۔ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ یہی احسان دیگر اقربا سے بھی کرو۔ اور ان لوگوں سے بھی جو معاشرہ میں کسی وجہ سے تنہا رہ گئے ہوں۔ یا جو حرکت کے قابل نہ رہیں اور ان کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے۔ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی۔ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِیْلِ۔ نیز ہمسایہ سے بھی، خواہ وہ قریب کا ہو یا دور کا۔ اپنوں میں سے ہو یا بیگانوں میں سے۔ نیز اپنے رفقائے کار کے ساتھ بھی۔ اور ان مسافروں کے ساتھ بھی جن کے پاس زادِ راہ نہ رہا ہو، یا وہ ویسے ہی تمہارے حسن سلوک کے متمنی ہوں۔ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ (۴/۳۶)۔ اور ان لوگوں کے ساتھ بھی جو تمہارے ماتحت کام کریں۔ ان سب کے ساتھ عدل کرو۔ ان کے حق میں کسی قسم کی کمی نہ کرو۔ اور اگر اس کے باوجود، ان میں کوئی کمی رہ جائے تو اس کمی کو بھی پورا کرو۔ اور اس کا دل میں خیال تک بھی نہ لاؤ کہ تم نے ان پر کوئی احسان کیا ہے، چہ جائیکہ اس احسان کی وجہ سے تم ان پر بارگراں بن جاؤ۔ اور انہیں خواہ مخواہ قلبی اور ذہنی اذیت پہنچاتے رہو۔ اس لئے کہ مومنین کا شعار یہ ہے کہ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًی (۲/۲۶۲)۔ وہ کسی کو کچھ دے کر اس کے سر پر سوار نہیں ہو جاتے۔ سر پر سوار ہونا تو ایک طرف، وہ ان سے کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا (۷۶/۹) ہم تم سے، اس کا بدلہ تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی خواہاں نہیں ہیں۔ اس لئے کہ ھَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (۵۵/۶۰)۔ اس کمی کی وجہ سے تمہارا توازن بگڑ رہا تھا۔ ہم نے اس توازن کو برقرار کر دیا۔ بس یہی اس کا بدلہ ہے۔ دوسروں کی کمی کو پورا کرنے کے سلسلہ میں وہ اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹)۔ وہ خود تنگی میں گزارہ کر لیتے ہیں اور دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں۔

والدین سے احسان

یہ تو احسان کی صورت ہے جس میں کچھ واپس لینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اگر کسی کو قرض دیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مقروض کی حالت سقیم ہے تو اس پر سختی نہیں کرتے بلکہ اسے اس وقت تک کی مہلت دیتے ہیں جب تک وہ آسانی سے قرض ادا کر دینے کے قابل نہ ہو جائے۔ اور اگر ایسا ہو کہ وہ قرضہ ادا کرنے کے قابل ہی نہیں رہا تو قرض معاف کر دیتے ہیں۔ وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَیْسَرَةٍ۔ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲/۲۸۰)۔

مقروض سے نرمی

ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی یہ خصوصیات ہوں وہ کسی کا مال ناحق کس طرح کھا جائیں گے اور جائز اور ناجائز کی تمیز کو کس طرح مٹا دیں گے؟ انہیں اس کی تاکید کی گئی ہے کہ لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَی الْحُکَّامِ لِتَاْکُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲/۱۸۸)۔ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق پر مت کھاؤ۔ یا اگر معاملہ عدالت

ناحق مال نہ کھاؤ

تک پہنچ چکا ہے تو ایسا نہ کرو کہ حکام کو رشوت دے کر ایسا فیصلہ کرا لو جس سے دوسروں کا کچھ مال ناجائز طور پر تمہیں مل جائے حالانکہ تم جانتے ہو کہ جو مال اس طرح حاصل کیا جائے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

☆

یہاں تک ضبطِ نفس کی ان حدود کا ذکر آیا ہے جن کا تعلق مال و دولت سے ہے۔ اس کے بعد جنسی جذبات میں ضبط و تحدید کی صورت سامنے آتی ہے۔ اس باب میں مومن انتہائی پاکبازی کا مظہر ہوتے ہیں۔ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (۲۳/۵)۔ وہ اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں عصمت و عفت کا لفظ صرف عورت کے

حفاظتِ عصمت

لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کریم اس باب میں، مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ وہ مردوں سے بھی اسی طرح عصمت کا مطالبہ کرتا ہے جس طرح عورتوں سے۔ وہ کہتا ہے کہ مومنین، زنا تو خیر بہت دور کی بات ہے، فواحش (یعنی عام بے حیائی کی باتوں) کے بھی قریب تک نہیں پھٹکتے، خواہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی ہو یا پوشیدہ۔ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔ (۶/۱۵۲)۔ خود بھی بچتے ہیں اور اس قسم کی تدابیر اختیار کرتے ہیں جن سے اس قسم کی باتیں معاشرہ میں پھیلنے نہ پائیں (۲۴/۱۹)۔ وہ اپنی نگاہوں کو کبھی بے باک نہیں ہونے دیتے کیونکہ ان سے کہا گیا ہے کہ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (۲۴/۳۰) اپنی نگاہوں کو بے باک مت ہونے دو۔ وہ جنسی بے راہ روی کے خیال تک کو اپنے دل میں نہیں آنے دیتے، اس لئے کہ ان کا ایمان ہے کہ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (۴۰/۱۹)۔ خدا، نگاہ کی خیانت اور دل میں پوشیدہ خیالات تک سے واقف ہے۔

علاوہ بریں، عام جذبات میں بھی ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ انہیں کبھی بدلگام اور حدود فراموش نہیں ہونے دیتے۔ اگر کبھی ان میں شدت پیدا بھی ہو تو وہ (تخریب کی بجائے) ان کا رُخ تعمیری کاموں کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ اسی لئے مومنین کی خصوصیت

خیالات کی پاکیزگی

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ (۳/۱۳۳) بتائی گئی ہے۔ اس کے معنی "غصے کو دبا لینے والے" نہیں۔ اس کے معنی ہیں، اس زائد قوت کو تعمیری کاموں کی طرف منتقل کر دینے والے۔ اس کے بعد ہے وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (۳/۱۳۳)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے مقامات پر یہ نہیں دیکھتے کہ دوسرے ان کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہیں (تاکہ وہ بھی ویسا ہی برتاؤ ان کے ساتھ کریں)۔ وہ ان کے برتاؤ سے قطع نظر کر کے، دیکھتے یہ ہیں کہ انہیں قوانینِ خداوندی کے مطابق کیا کرنا چاہیئے۔ ان کے جذبات کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے۔ وہ انہیں ہمیشہ اپنے کنٹرول میں رکھتے ہیں۔ اسی حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ

جذبات پر قابو

میں بیان کیا ہے کہ شیطان ان پر کبھی غلبہ نہیں پا سکتا۔ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲)۔ حتیٰ کہ اگر کبھی اس قسم کا کوئی خیال یونہی گھومتے پھرتے ان کے دل میں آ جائے تو وہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں۔ اور اس سے یوں ہوتا ہے گویا ایک دم روشنی ان کے سامنے آ گئی اور انہوں نے صحیح راستہ اختیار کر لیا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (۷/۲۰۱)۔ زندگی کے ہر شعبے میں، قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھنا، یہ ہے وہ سب سے بڑی قوت جس سے مومنین، غلط باتوں کے ارتکاب سے مجتنب رہتے ہیں۔ اس کو ذکر اللہ کہتے ہیں۔ ان قوانین کی

خلاف ورزی سے جو تباہیاں آتی ہیں، ان کا احساس انہیں کپکپا دیتا ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا

خشیتِ قلبی

ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ جب قوانینِ خداوندی کا مجموعی تصور ان کے سامنے آتا ہے تو ان کی خلاف ورزی سے جو تباہی آتی ہے اس کے احساس سے ان کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۸/۲)۔ اور جب ان قوانین کی تفاصیل ان کے سامنے آتی ہیں تو ان پر عمل پیرا ہونے کے خوشگوار نتائج کے تصور سے ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔ اور وہ ان قوانین کی محکمیت پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہیں۔ اور یہی وہ، قوانینِ خداوندی پر اعتماد کلی اور یقین کامل ہے جس سے انہیں استقامت حاصل ہوتی ہے اور ان کے پاؤں میں کبھی لغزش نہیں آتی۔ اسی لئے انہیں الصّٰبِرِيْنَ۔ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ (۳/۱۷)۔ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی مستقل مزاج۔ مصائبِ زندگی میں جم کر کھڑے ہونے والے۔ اپنے دعویٰ ایمان کو اپنے اعمال سے سچ کر دکھانے والے۔ اور قوانین خداوندی کا پورا پورا اتباع کرنے والے۔ اپنی تمام توانائیوں کو ان کے مطابق صرف کرنے والے۔

جذبات کو کنٹرول میں رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ لوگ کبھی عقل و فکر سے عاری نہیں ہوتے۔ اپنا دماغی توازن کبھی نہیں کھوتے۔ ہر معاملہ پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرکے صحیح نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ اسی لئے قرآن

صاحبانِ عقل و بصیرت

نے انہیں اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳/۱۹۰)۔ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ صاحبانِ عقل و بصیرت يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جو کائنات کی تخلیق پر غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳/۱۹۰)۔ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس عظیم کارگہِ کائنات کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ ان کے عقل و فکر سے کام لینے کی کیفیت یہ ہے کہ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۲۵/۷۳)۔ اور تو اور، جب ان کے سامنے ان کے رب کے احکام و قوانین پیش کئے جاتے ہیں تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔ انہیں غور و فکر سے قبول کرتے، اور علم و بصیرت کی رو سے ان پر عمل کرتے ہیں۔ اس طرح وحیِ خداوندی پر ایمان لاتے ہیں اور پھر اپنے جذبات کو اس وحی کے تابع رکھتے ہیں، کیونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸/۵۰)۔ "اس سے بڑھ کر راہ گم کردہ اور کون ہو سکتا ہے جو خدا کی راہ نمائی کے بغیر اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے ___ یوں، وحیِ خداوندی، علم و عقل اور جذبات کے حسین امتزاج سے، مردِ مومن کا قالب تیار ہوتا ہے۔

اقبالؒ کے الفاظ میں

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے — یہ ہے نہایت اندیشہ و کمالِ جنوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال — عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں

اور ظاہر ہے کہ جب مومنین خود کسی بات کو سوچے سمجھے بغیر نہ قبول کرتے ہیں نہ تسلیم، تو وہ دوسروں سے اپنی بات کس طرح دھاندلی سے منوا سکتے ہیں۔ وہ اپنے ہر دعوے کو دلیل و برہان کی رو سے پیش کرتے اور علم و

بصیرت کی رُو سے منواتے ہیں۔ چنانچہ نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ آپ اعلان کر دیجئے کہ اُدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ

دلائل و براہین

اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (۱۲/۱۰۸) میں تمہیں جو خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت ایسا کرتا ہوں۔ میں بھی یہی کرتا ہوں اور میرے متبعین بھی ایسا ہی کریں گے۔ ہماری دعوت علم و بصیرت پر مبنی ہوگی۔ اسی لئے جماعتِ مؤمنین سے تاکید کی گئی کہ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (۱۶/۱۲۵)۔ تم لوگوں کو، اپنے رب کے راستے کی طرف اس انداز سے دعوت دو کہ ان کے دل اور دماغ دونوں کی تسکین ہو جائے۔ وہ اسے ذہن اور قلب کی پوری رضامندی کے ساتھ مانیں۔ اور جو اعتراضات وہ پیش کریں ان کا جواب نہایت حسن کارانہ انداز سے دو۔ یوں ہی اندھا دھند مت جھگڑتے چلے جاؤ۔ فرعون جیسے سرکش اور متکبر کو بھی پہلے نرمی اور آشتی سے سمجھانے کی کوشش کرو۔ فَقُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی (۲۰/۴۴)۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح بات اس کی سمجھ میں آجائے اور وہ اپنی سرکشی کے تباہ کن نتائج سے ڈر جائے۔ لیکن اگر واسطہ ایسے لوگوں سے پڑ جائے جو اپنی ضد اور جہالت پر اڑے رہنا چاہیں اور کسی بات پر دھیان دینے کی کوشش ہی نہ کریں، تو ان سے اعراض برتو۔ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاھِلِیْنَ (۷/۱۹۹)۔ لیکن اس کے باوجود ایسے موقعہ کی تلاش میں رہو کہ وہ بات سننے پر آمادہ ہوں تو ان تک پھر خدا کا پیغام پہنچاؤ۔ وَذَکِّرْ بِہٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا کَسَبَتْ (۶/۷۰)۔ تاکہ وہ اپنی غلط روی کے باعث قرآن کی راہ نمائی سے محروم نہ رہنے پائیں۔

اپنی اصلاح

لیکن دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ کہنے والا خود اپنی اصلاح کرے۔ جماعتِ مؤمنین کا یہی شیوہ ہوتا ہے۔ وہ پہلے خود عمل کرتے ہیں اور پھر دوسروں کو اس کی دعوت دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے خدا کا ارشاد ہے کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۶۱/۲-۳)۔ تم وہ بات کیوں کہتے ہو جسے خود کر کے نہیں دکھاتے۔ اللہ کے نزدیک یہ انداز بڑا ناپسندیدہ ہے کہ تمہارے قول اور فعل میں تضاد ہو۔ ایسی نصیحت جس پر انسان خود عمل نہ کرے، محض شاعری بن کر رہ جاتی ہے۔

شاعری مت کرو

اور اس قسم کی روش مومن کا شعار زندگی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے قرآن میں آیا ہے کہ وَمَا عَلَّمْنٰہُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَہٗ (۳۶/۶۹)۔ ہم نے اپنے رسول کو شاعری نہیں سکھائی۔ شاعری اس کے شایانِ شان ہی نہ تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن نے شاعر اور مومن کو ایک دوسرے کی ضد بتایا ہے۔ چنانچہ سورۂ شعراء میں، شاعروں کی یہ خصوصیات بتائی ہیں کہ وہ اپنے تصورات کی دنیا میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ کبھی اس وادی میں، کبھی اس بیابان میں۔ ایک ایسے اونٹ کی طرح جسے جھوٹی پیاس ادھر اُدھر لئے پھرے۔ اور ان کی ساری عمر باتیں کرنے میں گزر جاتی ہے اور وہ عمل کے قریب تک نہیں پھٹکتے۔ ان خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد کہا اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۲۶/۲۲۷)۔ لیکن مومنین اس قسم کے نہیں ہوتے۔ وہ ابدی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے مطابق کام کر کے دکھاتے ہیں۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے جب شاعری کی مذمت کی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی بات کلامِ موزوں میں پیش کرے تو وہ قابلِ مذمت ہے اور اگر وہ اسے نثر میں بیان کرے تو قرآن کی رُو سے مستحسن۔ بات نثر اور نظم کی نہیں

بات اس ذہنیت کی ہے جسے قرآن نے "شاعری" سے تعبیر کیا ہے۔ اس ذہنیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے سامنے زندگی کا کوئی متعین مقصد اور نصب العین نہ ہو۔ وہ اپنے جذبات کی رو میں جو جی میں آئے کہتا چلا جائے اور جو کچھ کہے اس میں بھی تصنع اور بناوٹ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ وہ ساری عمر باتیں کرتا رہے ان پر عمل کبھی نہ کرے۔ ذہنیت اس کی یہ ہو اور وہ اُسے نوائے سروش سے تعبیر کر کے اپنے آپ کو صاحبِ وجدان قرار دے۔ یہ ہے وہ ذہنیت جسے مومن کی ذہنیت کی ضد قرار دیا گیا ہے خواہ اس ذہنیت کا حامل، نثر میں بات کرے یا نظم میں۔ مومن کے سامنے ایک متعین نصب العین حیات ہوتا ہے۔ اور وہ جو کچھ کہتا ہے اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ چھوٹی موٹی لغزشیں مومنین سے بھی ہو جاتی ہیں۔ یہ معصوم عن الخطاء نہیں ہوتے۔ لیکن یہ لغزشیں ان سے سہو و خطا کی بناء پر نادانستہ سرزد ہوتی ہیں جن سے وہ فوراً تائب ہو جاتے ہیں۔ وہ بنیادی غلط روی سے، جسے قرآن نے کبائر سے تعبیر کیا ہے، ہمیشہ مجتنب رہتے ہیں۔

چھوٹی موٹی لغزشیں

اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (۵۳/۳۲)۔ مومن وہ ہیں جو بنیادی غلط کاریوں اور بے حیائی کی باتوں سے ہمیشہ بچتے ہیں۔ ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ ان سے کبھی کبھار نادانستہ کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہو جائے۔ لہٰذا مومن کا انداز یہ ہے کہ وہ جس بات کی دوسروں کو نصیحت کرتا ہے اس پر پہلے خود عمل کرتا ہے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کوئی شخص کسی کو اس کی غلطی پر ٹوکے تو وہ اسے یہ کہہ کر جھٹک دے کہ میاں! پہلے اپنی اصلاح تو کرو۔ پھر دوسروں سے کہنا۔ نہیں! مومن کا یہ شعار نہیں۔ وہ کہنے والے کی بات کو توجہ سے سنتا ہے۔ پھر اپنا جائزہ لیتا ہے اور اگر دیکھتا ہے کہ اس میں واقعی وہ کمزوری موجود ہے تو اس کی اصلاح کر

اعتراض کی بجائے اصلاح

لیتا ہے اس لئے کہ وہ اس اصول کو پیشِ نظر رکھتا ہے جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ۔ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ (۵/۱۰۵) "تم اپنی اصلاح کی فکر کرو۔ اگر تم صحیح راستے پر جا رہے ہو، تو غلط راستے پر چلنے والا تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا"۔ اس لئے جو شخص تمہاری غلط روی پر ٹوکتا ہے اس کی بات سننے سے یہ کہہ کر انکار نہ کر دو کہ جب تم خود اس پر عمل نہیں کرتے تو تمہیں دوسروں کو نصیحت کرنے کا کیا حق ہے؟ تمہیں تمہاری غلط روی کا نقصان پہنچے گا۔ اس کی غلط روی کا نہیں۔ اس لئے کہ وَلَا تَکْسِبُ کُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (۶/۱۶۴) ہر شخص اپنی غلط روی کا خمیازہ خود بھگتے گا۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا، کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

لیکن اپنی اصلاح کرنے کے بعد، مومن کی یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ وہ ہر ایک پر اپنی نیکیوں کی دھونس جماتا رہتا ہے اور معاشرہ میں بڑا پاکباز بن کر، اپنے آپ کو فریب دیتا اور دوسروں پر رعب گانٹھتا ہے۔ قطعاً نہیں۔

اپنی پاکبازی کی دھونس نہ جماؤ

اس لئے کہ اس کے سامنے یہ اصول ہوتا ہے کہ فَلَا تُزَکُّوْٓا اَنْفُسَکُمْ۔ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی (۵۳/۳۲)۔ یونہی اپنے آپ کو پاکباز نہ ٹھیراتے پھرو۔ اس کا فیصلہ میزانِ خداوندی کی رو سے ہوتا ہے کہ تم میں سے کون تقویٰ شعار ہے۔ مومن

کا تو شعار یہ ہے کہ اس میں جس قدر زیادہ خوبیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں، وہ اسی قدر (شاخِ ثمردار کی طرح) اور جھکتا چلا جاتا ہے۔ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (۲۵/۶۳)۔ اللہ کے بندوں کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنے اندر جھوٹا تکبر پیدا نہیں ہونے دیتے۔ خوبیوں کا وزن انہیں اور جھکا دیتا ہے۔

لیکن جھکنے کے معنی یہ نہیں کہ وہ ہر ایک سے دبتے چلے جاتے ہیں۔ قطعاً نہیں۔ وہ جھکتے ہیں حق کے سامنے۔

باطل کا مقابلہ کرتے ہیں

لیکن جو حق کی مخالفت کرتا اور اس سے سرکشی برتتا ہے، اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جہاں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کو رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کہا ہے (یعنی آپس میں، ایک دوسرے کے ساتھ، بڑی محبت اور نرمی سے سلوک کرنے والے) وہاں انہیں اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (۲۹/۴۸) بھی قرار دیا گیا ہے۔ یعنی حق کی مخالفت کرنے والوں کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت۔ مومن کی کیفیت یہ ہے کہ:

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

خود نبی اکرمؐ کے متعلق قرآن میں ہے کہ یہ خدا کی رحمت ہے کہ آپؐ اس قدر نرم دل واقع ہوئے ہیں۔ اگر آپؐ سخت مزاج اور سنگدل ہوتے تو آپ کی جماعت کے افراد آپ سے الگ ہو جاتے" (۳/۱۵۹)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حضورؐ سے تاکیداً کہا گیا کہ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (۹/۷۳)۔ اے نبیؐ! جو لوگ حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ یا جو تمہارے ساتھ رہتے ہوئے، منافقانہ روش اختیار کرتے ہیں، ان سے جہاد کرو۔ اور ان کے خلاف شدت اختیار کرو۔ یعنی جو لوگ کھلے بندوں حق کی مخالفت کریں اور سرکشی اختیار کریں۔ یا جو لوگ منافقت برتیں، ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ نہیں کیا جائے گا۔ ان کی مخالفت یا منافقت کو سختی سے روکا جائے گا۔ یاد رکھئے! مومنین کے معاشرہ میں، منافقین کا وجود ـــــ یعنی وہ لوگ جو بظاہر کچھ اور بات کریں اور ان کے دل میں کچھ اور ہو ـــــ ایک زہر آلود چھالنس ہوتی ہے، جس کا علاج نہایت ضروری ہے۔ اس کے لئے اگر نوکِ نشتر کی بھی ضرورت پڑے تو اس میں بھی تامل نہیں کرنا چاہیئے۔ مومن کی نرم مزاجی کے یہ معنی نہیں کہ وہ منافقین کے سامنے بھی جھک کر رہتا ہے۔ ایسا کرنا تو خود منافقت اور مداہنت ہوگی۔ وہ منافق سے برملا کہہ دیتا ہے کہ تم منافقت برتتے ہو۔ ہم تمہارے دوست نہیں ہو سکتے۔ اور دوسروں کو بھی اس کی منافقت سے آگاہ کرتا ہے تاکہ وہ کسی کو دھوکا نہ دے سکے۔ اس باب میں قرآن کی تعلیم بڑی واضح اور اس کی تاکید بڑی سخت ہے۔ اس لئے مومنین، حق کے مخالفین اور منافقین سے برملا کہہ دیتے ہیں کہ تمہارے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ تم ہمارے دوست اور رازدار نہیں ہو سکتے۔ سورۂ توبہ میں ہے۔

منافق کی مخالفت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۔ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (۹/۲۳)۔

اے جماعتِ مومنین! اگر تمہارے باپ اور بھائی بھی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ عزیز رکھتے

ہیں، تو انہیں اپنا دوست مت بناؤ۔ تم میں سے جو کوئی انہیں اپنا دوست رکھے گا تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں۔

اتنا ہی نہیں۔ عزیز سے عزیز دوست۔ قریبی سے قریبی رشتہ دار۔ بیوی بچے۔ مال و دولت۔ سامانِ زیبائش۔ متاعِ حیات۔ غرضیکہ دنیا کی کوئی چیز بھی، مومن کے نزدیک، ایمان اور اسلامی نظام کے مقابلہ میں عزیز نہیں ہو سکتی۔ یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ وجہِ جاذبیت ہیں۔ لیکن جب ان میں اور ایمان کے کسی تقاضے میں تصادم ہو، تو ان میں سے کسی ایک کو بھی ایمانی تقاضے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ یہی ایمان کا تقاضا ہے اور مومنین کا شعار ان کے

ایمان کے معنی

خدا کا حکم یہ ہے کہ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اے رسولؐ! ان سے کہدو کہ اگر تمہارے ماں باپ۔ بہن بھائی۔ بیوی بچے۔ عزیز رشتہ دار۔ وہ مال و دولت جسے تم اتنی محنت سے کماتے ہو۔ وہ کاروبار جس کے مندا پڑ جانے سے تم خائف رہتے ہو اور وہ محلات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی چیز اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ۔ تمہیں خدا اور اس کے رسول اور خدا کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہو گئی۔ فَتَرَبَّصُوْا۔ حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ ط تو تم انتظار کرو۔ تا آنکہ خدا کا قانونِ مکافات تمہاری اس روش کا تباہ کن نتیجہ تمہارے سامنے لے آئے۔ تمہاری یہ روش مومنین کی روش نہیں۔ فاسقین کی ہوگی۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (۹/۲۴)۔ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ فاسقین پر ــــ یعنی جو صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راہوں پر چل نکلیں۔ کبھی کامیابیوں کی راہ کشادہ نہیں ہوتی۔

مومن کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس نے اپنا مال اور جان، سب خدا کے ہاتھ بیچ دیئے ہوتے ہیں۔ جس دن وہ خدا پر ایمان لاتا ہے خدا اس معاہدہ کا اعلان کر دیتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ سن رکھو کہ اللہ نے مومنین کا جان اور مال، جنت کے عوض خرید لیا ہے۔ ان کی کیفیت یہ

مال اور جانِ خدا کے

کہ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ (۹/۱۱۱)۔ وہ خدا کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پھر یا تو فاتح و منصور واپس لوٹتے ہیں۔ اور یا میدانِ جنگ میں جان دے دیتے ہیں۔ ان مومنین کی صفات یہ ہیں کہ اَلتَّآئِبُوْنَ۔ سفر حیات میں وہ جہاں دیکھتے ہیں کہ ان کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا ہے، وہ وہیں رک جاتے ہیں۔ اور جہاں سے قدم غلط اٹھا تھا وہاں واپس آ کر صحیح راستے پر ہو لیتے ہیں۔

مومنین کی صفات

اَلْعٰبِدُوْنَ۔ وہ قوانینِ خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں۔ اَلْحَامِدُوْنَ۔ وہ انفس و آفاق کی ہر شے پر غور و فکر کرنے کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کارگہِ کائنات کی ایک ایک شے اپنے خالق کی حمد و ستائش کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اَلسَّآئِحُوْنَ۔ وہ اس مقصد کے لئے دنیا بھر کا سفر کرتے ہیں۔ اَلرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ۔ وہ ہمیشہ قانونِ خداوندی کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔ اور دل کے پورے جھکاؤ سے، اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وہ ان باتوں کا حکم دیتے ہیں جنہیں قانونِ خداوندی صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے روکتے ہیں جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ۔ وہ ان تمام حدود کی نگہداشت کرتے ہیں جنہیں قانون

خداوندی نے متعین کیا ہے اور ان کے اندر رہتے ہوئے صحیح آزادی کی زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۳۳/۴۷)۔ یہ ہیں وہ مومن جن کے لئے دُنیا اور آخرت کی زندگی کی خوشگواریوں کی بشارتیں ہیں۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ صفات جن کے حامل انسان کو مومن کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ ان تمام صفات میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ قرآنِ کریم میں مومن کی کوئی ایک خصوصیت بھی ایسی نہیں جو صرف مردوں کے لئے مخصوص ہو اور اس میں عورتیں شامل نہ ہوں۔

مردوں اور عورتوں دونوں کی خصوصیات

اگرچہ خود لفظ "مومنین" کے اندر مرد اور عورتیں از خود شامل ہیں لیکن قرآنِ کریم نے ایک مقام پر مومن مردوں اور مومن عورتوں کا ذکر اس طرح علیحدہ علیحدہ کیا ہے کہ مصافِ زندگی میں دونوں، ایک ہی صف میں، ساتھ ساتھ چلتے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ سورۂ احزاب کی آیت (۳۳/۳۵) کو دیکھئے۔ اس میں کس وضاحت اور صراحت سے کہہ گیا ہے کہ اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی تکمیلِ ذات کرسکتے ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے (اَلْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ) اگر مرد اس پارٹی (جماعت) کے رکن بن سکتے ہیں جو خدا کے قانون کے اٹل نتائج پر یقین رکھتے ہوئے امنِ عالم کی ذمہ دار ہو تو عورتیں بھی اس جماعت کی اسی طرح رکن ہوسکتی ہیں (الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ) اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی استعداد کو اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ ان کا استعمال صرف قانونِ خداوندی کے مطابق ہو تو یہی صلاحیت عورتوں میں بھی ہے (وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ) اگر مرد اپنے دعوئے ایمان کو اعمال سے سچ کر دکھانے کے اہل ہیں تو عورتیں بھی اس کے اہل ہیں (وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ) اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی رہ سکتی ہیں (وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ) اگر مرد اس خصوصیت کے حامل ہوسکتے ہیں کہ جوں جوں ان کی صلاحیتیں بڑھتی جائیں وہ شاخِ ثمردار کی طرح قانونِ خداوندی کی اطاعت میں اور جھکتے چلے جائیں تو یہی خصوصیت عورتوں میں بھی ہے۔ (وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ) اگر مردوں میں ایثار کا مادہ ہے تو عورتوں میں بھی ہے (وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ) اگر مرد اپنے آپ پر ایسا کنٹرول رکھ سکتے ہیں کہ انہیں جہاں سے روکا جائے وہ رُک جائیں، تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے (وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ)۔ اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضوابط کی پابندی میں رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کرسکتی ہیں (وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ)۔ اگر مرد قانونِ خداوندی کو شعوری طور پر سمجھنے اور اسے ہر وقت پیشِ نظر رکھنے کے اہل ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی اہلیت ہے (وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ) جب یہ صلاحیتیں دونوں میں موجود ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر موجود ہونے چاہئیں۔ فلہٰذا نظامِ خداوندی میں دونوں کے لئے حفاظت کا سامان اور اجرِ عظیم موجود ہے (اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا)۔ سورۂ توبہ میں مومنین کی جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے (اور جنہیں پہلے بیان کیا جا چکا ہے) ان میں ایک صفت اَلسَّآئِحُوْنَ بھی ہے۔ یعنی دُنیا کا سفر، یا سیر و سیاحت کرنے والے۔ عورت کے متعلق جو نظریہ ہمارے ذہنوں میں راسخ ہے، اس کے پیشِ نظر خیال گزر سکتا تھا کہ کم از کم اس صفت میں مومن عورتیں شریک نہیں ہوں گی۔ قرآنِ کریم نے سٰٓئِحٰتٌ (۶۶/۵) کا ذکر خاص طور پر کرکے اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا اور اس کی وضاحت کر دی کہ اس صفت میں بھی مومن عورتیں مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں۔

یہ ہیں وہ صفات و خصائص جن کے حامل افراد سے قرآن وہ اُمت تشکیل کرتا ہے جو تمام عالم انسانیت میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲/۱۴۳)۔ اس طرح ہم نے تمہیں ایک مرکزی اُمت بنا دیا۔ تاکہ تم عالم انسانیت کے اعمال کی نگرانی کرو (کہ وہ حق و انصاف پر قائم رہیں) اور تمہارا رسول تمہارے اعمال کی نگرانی کرے کہ تم نظامِ خداوندی کے مطابق چلتے رہو۔ دوسری جگہ ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ تم ایک بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے ـــــ یہ بھلائی کیا ہے؟ یہ کہ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۱۰)۔ تم ان باتوں کا حکم دیتے ہو جنہیں وحی خداوندی مستحسن قرار دیتی ہے اور ان سے روکتے ہو جنہیں وہ ناپسندیدہ ٹھیراتی ہے۔ یعنی یہ لوگ (مؤمنین) پہلے اپنی زندگی وحیٔ خداوندی کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ پھر ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس سے دوسرے لوگ بھی وحی کا اتباع کرتے جائیں ـــــ اسے قرآن کی اصطلاح میں نظامِ صلوٰۃ کہتے ہیں۔ اور مقصد اس تگ و تاز سے یہ ہے کہ تمام افرادِ انسانیہ کو وہ ذرائع اور سامان میسر آتا رہے جس سے اس کی طبیعی زندگی اور ذات کی نشوونما ہوتی چلی جائے۔ اسے ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ یعنی نوعِ انسان کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانا۔ چنانچہ قرآن کریم میں جماعتِ مومنین کے ان ہر دو فرائض (ذمہ داریوں) کو بار بار دہرایا گیا ہے ـــــ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (۲۷/۳)۔ حتیٰ کہ ان کی مملکت اور حکومت کی غرض و غایت بھی یہی بتائی گئی ہے۔ سورۂ حج میں ہے۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ۔ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲/۴۱)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں ملک میں اختیار و اقتدار حاصل ہو گیا تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے اور نوعِ انسان کی نشوونما کا انتظام کریں گے۔

اقامتِ صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ

ان باتوں کا حکم دیں گے جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے روکیں گے جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے اور ان کے تمام معاملات منشائے خداوندی کے مطابق طے ہوں گے۔ اس مقام پر ایک نکتہ کی وضاحت ضروری نظر آتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ خیال عام کیا جاتا ہے کہ اسلام میں، عورتوں کو نظامِ مملکت میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نظریہ قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ جو آیت ابھی ابھی آپ کے سامنے آئی ہے اس میں اسلامی حکومت کا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر بتایا گیا ہے، اور دوسرے مقام پر اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ فریضہ مردوں اور عورتوں دونوں کا ہے۔ تنہا مردوں کا نہیں۔ سورۂ توبہ میں ہے۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ..... (۹/۷۱)۔ مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ ان کا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

بہرحال، کہا یہ جا رہا تھا کہ جماعتِ مومنین کا فریضہ ہے کہ وہ دُنیا سے بُرائیوں کی روک تھام کا انتظام کریں۔ لیکن یہ روک تھام اندھی قوت کے زور سے نہیں ہو گی۔ وہ بھلائیوں کو اس قدر عام کرتے چلے جائیں گے کہ بُرائیاں خود بخود اپنی جگہ چھوڑتی جائیں، جس طرح تاریکی دُور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ روشنی لے آیئے۔ وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (۱۳/۲۲)۔ البتہ جو لوگ نظامِ حق و صداقت کے خلاف سرکشی پر اتر آئیں اور ظلم و استبداد

سے کسی طرح باز ہی نہ آئیں، تو خلقِ خدا کو ان کے جور و ستم سے محفوظ رکھنے کے لئے، قوت کا استعمال ناگزیر ہوگا۔

شمشیر زنِ مومن

یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ج ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا کہ وہ لوگوں کو علم و بصیرت کی رُو سے حق کی دعوت دیں۔ پھر ان کے ساتھ ضوابط قانون بھی نازل کئے کہ دُنیا میں عدل قائم رکھا جا سکے۔ لیکن جو لوگ نہ دلائل و براہین کی رو سے مانیں۔ نہ قانونِ عدل و انصاف کی پابندی اور احترام کریں تو ان کے لئے: وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ (۲۵/۵۷)۔ ہم نے شمشیرِ خاراشگاف بھی نازل کی۔ جماعتِ مومنین، شمشیر کا استعمال مظلوم کی حمایت اور ظالم کے ظلم کی مدافعت کے لئے کرتی ہے۔ اس مقصد کے لئے اگر دُنیا کی کوئی اور قوم کسی قسم کی کوشش کرتی ہے تو جماعتِ مومنین ان کے ساتھ تعاون کرتی ہے۔ لیکن غلط کاموں میں کسی کا ساتھ نہیں دیتی۔ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۵/۲)۔ ان کا شعار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً یَّكُنْ لَّهٗ نَصِیْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا (۴/۸۵)۔ جو کسی اچھے کام میں دوسرے کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کے خوشگوار نتائج میں اس کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ اور جو کسی

تعاون

خراب کام میں کسی کا ساتھ دیتا ہے، تو اس کے مضر نتائج کی ذمہ داری اس پر بھی عائد ہوتی ہے۔

یہ ہیں وہ بلند مقاصدِ حیات جن کے لئے جماعتِ مومنین کے افراد ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے زندگی کی متلاطم ندیوں کو مردانہ وار پار کئے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ انہیں تعلیم ہی یہ دی گئی ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۳/۲۰۰)۔ تم اپنے مسلک پر نہایت استقامت سے جمے رہو اور ایک دوسرے کی استقامت کا موجب بنو

ربطِ باہمی

ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر رہو۔ اور ہر قدم پر قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ یہی وہ روش ہے جس سے تمہیں سفرِ حیات میں کامیابی حاصل ہوگی۔ اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر گویا تم بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ (۶۱/۴) ہو گویا ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے کہ حوادثِ زمانہ کی سرکش موجیں اس سے آ کر ٹکرائیں تو اپنا سر پھوڑ کر پیچھے ہٹ جائیں ان کے اس ارتباطِ باہمی اور باہمدگر پیوستگی کا ذریعہ، تمسک بالقرآن (خدا کی کتاب کے ساتھ وابستگی) ہوتا ہے کہ ان سے کہا گیا ہے کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۳)۔ تم خدا کی کتاب کے ساتھ، سب کے سب مل کر، پوری مضبوطی سے وابستہ رہو۔ اور آپس میں تفرقہ پیدا مت کرو۔ اس لئے کہ باہمی تفرقہ ـــــ اُمت کا فرقوں میں بٹ جانا ـــــ توحید نہیں، شرک ہے۔ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا۔ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۲)۔ دیکھنا! تم کہیں

تفرقہ شرک ہے

(اسلام لانے کے بعد پھر) مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن گئے۔ اس سے کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ میں حق پر ہوں (اور باقی سب باطل پر ہیں)۔ اور یوں امت کی اجتماعیت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اس کے برعکس اُمت کی وحدت اور استقامت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان پر رحمتوں کے

فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ جو انہیں دنیا اور آخرت میں زندگی کی خوشگوار یوں کی بشارتیں دیتے ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ یہ واقعہ ہے کہ جو لوگ اس حقیقت پر ایمان لاتے ہیں کہ ہمارا تشو و نما دینے والا اللہ ہے۔ اور پھر اس دعویٰ پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں جو ان سے کہتے ہیں کہ تم نہ کسی قسم کا خوف کھاؤ۔ نہ افسردہ خاطر ہو۔ اور اس جنتی زندگی کی خوشخبری لو۔ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ۔ ہم دنیا میں بھی تمہارے رفیق اور ساتھی ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ۔ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ۔ (۴۱:۳۰-۳۱)۔ تمہیں دنیا اور آخرت میں، جو تمہارا جی چاہے گا ملے گا۔ جو مانگو گے، پاؤ گے۔ ہر قسم کی سربلندیاں اور سرفرازیاں تمہارے حصے میں آئیں گی۔ اور یہ سب تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوں گی۔ تِلْکُمُ الْجَنَّۃُ اُوْرِثْتُمُوْھَا بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۳:۷۲)۔ یہ وہ جنت ہے جس کے تم، اپنے اعمال کی وجہ سے، مالک بنائے گئے ہو۔

یہ ہیں وہ خصوصیات جن کے حامل انسانوں کو مومن کہا گیا ہے۔ انہیں زندگی کی جن خوشگواریوں اور سربلندیوں کی بشارت دی گئی ہے، وہ انہی خصوصیات کا فطری نتیجہ ہوتی ہیں۔ محض مومن کہلانے اور مسلمان نام رکھا لینے سے یہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتٰبِ (۴:۱۲۳)۔ یہ نتائج نہ تمہاری خوش فہمیوں سے حاصل ہو سکتے ہیں نہ ان اہل کتاب کی خالی تمناؤں سے۔ یہ تو صرف ان خصوصیات کے پیدا کرنے سے حاصل ہوں گے جنہیں مومنین کی صفات کہہ کر پکارا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی میں یہ خصوصیات موجود نہ ہوں اور وہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسے "دینی اعمال" پر بھی محض میکانکی طور پر کاربند ہو، تو بھی یہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔

نیکی کا صحیح مفہوم

قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ۔ اس کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ تم ان بلند حقیقتوں پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھو جنہیں اجمالاً ایمان کہا گیا ہے — یعنی خدا اور اس کے قانونِ مکافات پر ایمان۔ زندگی کے تسلسل پر ایمان۔ وحی کی رُو سے دیئے ہوئے ضابطہ قوانین پر ایمان۔ انبیاء اور ملائکہ پر ایمان — نیکی اس کی ہے جو ان حقیقتوں پر یقین محکم رکھے اور پھر اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ۔ مال و دولت کی محبت کے باوجود اسے دوسروں کی پرورش کے لئے دے دے۔ وہ رشتے دار ہوں یا ایسے لوگ جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے یا ان میں کام کاج کی استطاعت نہ رہے۔ یا ایسے مسافر جو زادِ سفر سے محروم رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے کافی نہ ہو۔ یا وہ دوسروں کے پنجۂ استبداد میں گرفتار ہوں۔ ان مقاصد کے لئے مال و دولت کا پیش کر دینا۔ یہ نیکی ہے۔ مختصر الفاظ میں نیکی یہ ہے کہ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ۔ ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں تمام افرادِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کا اتباع کریں اس وقت فریضۂ صلوٰۃ کی پابندی کریں اور نوعِ انسان کی پرورش کا سامان مہیا کریں۔ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ

اِذَا عٰهَدُوْا ۚ نیکی ان کی ہے جو اپنے عہد و پیمان کا احترام کریں اور قول اقرار کے پکّے ہوں۔ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اور جب مشکلات کا سامنا ہو تو نہایت ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کریں۔ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (۲/۱۷۷)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دعوئ ایمان کو اپنے اعمال سے سچّا ثابت کر دکھاتے ہیں۔ اور یہی ہیں وہ جو متقی کہلانے کے مستحق ہیں۔ نہ وہ جو محض رسمی طور پہ نماز روزہ کی پابندی کر کے اس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم پکّے مومن ہیں اور بڑے نیک کام کر رہے ہیں۔ یہی نہیں۔ بلکہ ایسے خیراتی کام جنہیں عام طور پہ "کارِ خیر" سمجھا جاتا ہے، وہ بھی نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے جدوجہد کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ سورۂ توبہ میں ہے اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاۗجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے سبیلیں لگا دینے والا یا خانہ کعبہ کی زیبائش و آرائش اور آبادکاری کے کاموں میں حصّہ لینے والا، اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو خدا اور اس کے قانونِ

خیرات کے کام

مکافات اور حیاتِ اخروی پر ایمان رکھے اور نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے مسلسل جدوجہد کرتا رہے! تم اپنی خوش عقیدگی کی بنا پر کچھ ہی کیوں نہ سمجھو۔ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ میزانِ خداوندی میں یہ دونوں کبھی ہم پلہ نہیں ہو سکتے۔ ایسا سمجھنا بڑی زیادتی ہے۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۲/۲۵۸)۔ اور خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ اس قسم کی زیادتی کرنے والوں پر کامیابی کی راہیں کبھی نہیں کھلا کرتیں۔ یہودیوں کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ اسی قسم کی خود فریبی میں مبتلا تھے۔ انہوں نے معاشرہ کا نظام ایسا قائم کر رکھا تھا جس میں کمزور، غریب، ناتواں افراد، اپنا گھر بار چھوڑ کر باہر نکل جانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ جب وہ اس طرح باہر نکل کر، غیر محفوظ ہو جاتے اور دوسروں کے چنگل میں پھنس جاتے تو پھر وہی ان کے ابنائے وطن جن کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر وہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے، خیرات کے پیسوں سے ان کا فدیہ ادا کرتے اور سمجھتے کہ ہم بڑا ثواب کا کام کر رہے ہیں۔ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ (۲/۸۵)۔ حالانکہ ایسا نظام قائم کرنا جس میں معاشرہ کے غریب اور کمزور افراد، مظلومیت کا شکار ہو جائیں، ایسا جرمِ عظیم ہے جس کا کفارہ اس قسم کے خیرات کے کام کبھی نہیں بن سکتے۔ جماعتِ مومنین اس قسم کی خود فریبی کا شکار نہیں ہوتی۔ وہ نظام ایسا قائم کرتے ہیں جس میں اس قسم کے انفرادی خیراتی کاموں کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ قرآن تسلیم کرتا ہے کہ اہلِ کتاب میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو انفرادی طور پر دیانتدار ہیں لیکن اس کے باوجود وہ انہیں نظامِ خداوندی کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس لئے کہ ان کا نظامِ معاشرہ اس قسم کا ہوتا ہے جس میں ان کی انفرادی نیکیاں خوشگوار نتائج پیدا نہیں کر سکتیں۔ دیکھئے قرآن اس حقیقت کو کیسے واضح اور بلیغ انداز میں پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَاۗىِٕمًا ۭ ان اہلِ کتاب میں وہ بھی ہے جس کے پاس اگر چاندی سونے کا ڈھیر بھی بطور امانت رکھ دیا جائے تو وہ اسے جوں کا توں واپس کر دے۔ اور ایسا بھی کہ اگر اس پر ایک روپے کا بھی اعتماد کرو تو وہ اسے کبھی واپس نہ کرے بجز اس کے کہ تم اس کے سر پہ ڈنڈا لے کر سوار

رہو۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ یہ اس لئے کہ ان کا نظامِ معاشرہ قومی عصبیت کی بنیادوں پر قائم ہے جس میں یہ عقیدہ دل کی گہرائیوں میں راسخ کر دیا جاتا ہے کہ تم دوسری اقوام کے لوگوں کے ساتھ جو چاہے کرو۔ اس سے تم پر کوئی الزام نہیں ہوگا۔ اور تماشا یہ کہ ان کے مذہبی پیشوا انہیں یہ بتاتے ہیں کہ یہ شریعتِ خداوندی کے عین مطابق ہے حالانکہ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ (۳/۷۵)۔ یہ خدا کے خلاف صریح کذب و افترا ہے اور ایسا کہنے والے خوب جانتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے۔

قرآن کریم نے مثال تو یہودیوں کی دی ہے کہ وہ ایسا معاشرہ قائم کرتے تھے جس میں ان کے کمزور اور غریب بھائی گھروں سے بے گھر ہونے پر مجبور ہو جائیں اور اس طرح جب وہ دوسروں کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے تھے تو انہیں چھڑانے کے لئے فنڈ اکٹھا کرتے تھے اور اسے بڑا ثواب کا کام سمجھتے تھے۔ لیکن اس سے اس نے اصول بہت بلند پیش کیا ہے۔ یعنی ایسا معاشرہ قائم کرنا جس میں غریب لوگ محتاج سے محتاج تر ہوتے جائیں اور اس کے بعد ان کی طرف خیرات کے چند ٹکے پھینک کر یہ سمجھنا کہ ہم نے بڑا ثواب کا کام کیا ہے جرمِ عظیم ہے فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ .... (۲/۸۵)۔ جو قوم بھی ایسا کرے گی اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوگی اور آخرت میں بھی سخت عذاب کی مستحق۔

المختصر، یہ ہیں وہ خصوصیات جن کے حاملین کو مومن کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے مومن اور مسلم کے الفاظ اکثر مقامات پر ہم معنی استعمال کئے ہیں۔ لیکن ایک جگہ ایسی تشریح بھی کی گئی ہے جس سے، بعض گوشوں میں، ان دونوں کا فرق سامنے آجاتا ہے۔ سورۂ حجرات میں ہے۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ یہ بدوی قبائل، جو اسلامی مملکت کے قیام کے بعد، مسلمان ہوئے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا۔ ان سے کہو کہ یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور اس طرح مومن بن گئے ہیں۔ بلکہ یہ کہو کہ ہم اس مملکت کے سامنے جھک گئے ہیں وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ ابھی تک ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا .... اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (۴۹/۱۵)۔

مومن اور مسلم کا فرق

مومن کہلانے کے مستحق وہ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر، دل کی کامل رضامندی سے ایمان لاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں کسی قسم کے شک و شبہ کا گزر تک نہیں ہوتا۔ پھر وہ، اپنی جان اور مال سے، خدا کی راہ میں جہاد کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہیں وہ جو اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہوتے ہیں۔

اس سے ہمارے سامنے مسلم اور مومن کا فرق آجاتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ مسلم وہ ہے جس سے احکامِ خداوندی کی اطاعت، قانون کے ذریعے جبراً کرائی جاتی ہے۔ اور ان احکام کی اطاعت کا جذبہ جس کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے اسے مومن کہتے ہیں۔ مومن کی ذات (PERSONALITY) کی نشوونما اس طرح ہو جاتی ہے کہ وہ تمام صفات و خصوصیات جن کا ذکر گزشتہ اوراق میں کیا گیا ہے، اس کے مختلف گوشے (FACETS) بن

جاتے ہیں، اس لئے وہ ان صفات کا فطری مظہر ہوتا ہے جس طرح سورج، روشنی اور حرارت کا فطری مظہر ہے۔ اسلامی معاشرہ کے اندر اگر "مسلم" ان قوانین کی اطاعت سے ان کے اثرات کو اپنے دل میں جذب کرتا جاتا ہے اور یوں اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ تو وہ بھی مقامِ مومن تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے جہاں اعراب سے کہا گیا کہ وہ ابھی اپنے آپ کو مومن نہ کہیں کیونکہ ہنوز ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا، وہاں ان سے یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۴۹/۱۴)۔ اگر تم نظامِ خداوندی کی اطاعت کرتے جاؤ گے تو تمہارے اعمال میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی۔ ان کے نتائج مرتب ہوتے چلے جائیں گے۔ اس طرح تخریبی عناصر سے تمہاری ذات کی حفاظت ہو جائے گی اور اس کی نشوونما کا سامان بھی تمہیں ملتا جائے گا۔ بشرطیکہ تم نے یہ اطاعت، محض رسمی طور پر نہ کی۔ اگر ایسا کرو گے تو مسلم کے مسلم ہی رہو گے۔ مومن نہیں بن سکو گے

نفسیاتی تبدیلی

اسلامی نظام درحقیقت، اُس تبدیلی سے قائم ہوتا ہے جو جماعتِ مومنین کے قلب میں پیدا ہوتی ہے۔ اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی کے بغیر، نظامِ خداوندی متشکل ہی نہیں ہو سکتا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱) — یعنی خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک اس قوم کے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا ہو جائے — یہ ایسی سنت اللہ (خدا کا اٹل قانون) ہے جس میں کبھی تغیر نہیں ہوتا۔ جماعتِ مومنین، اسی نفسیاتی تبدیلی کا مظہر ہوتی ہے اور یہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے اُس قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

اس حقیقت کو ایک بار پھر سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ بات قرآن کریم کی صحیح تعلیم اور اس کے مطابق تربیت سے پیدا ہوتی ہے ایک چیز ہے اسلام کی دعوت کا فکری طور پر سمجھنا اور اس طرح ذہنی طور پر اس کی صداقت کا معترف ہو جانا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دماغ میں اس دعوت کے متعلق شکوک و شبہات پیدا نہیں ہوتے اور اس کے خلاف منطقی دلائل اور فلسفیانہ اعتراضات اسے ڈگمگا نہیں دیتے۔ لیکن ایمان کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب اس دعوت کے کسی تقاضے (یعنی مستقل قدر) اور انسان کی طبیعی زندگی کے کسی تقاضے میں (خواہ وہ محض جذباتی بات ہو یا محسوس مفاد کا سوال) تصادم ہو اور وہ طبیعی زندگی کے تقاضے پر، مستقل قدر کے تقاضے کو ترجیح دے۔ یہ ہے وہ ایمان جو دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوتا ہے۔ اسی کے حاملین کو مومن کہتے ہیں جن کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝ (۲/۱۵۷)

میں اس حقیقت کو پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ ابھی ابھی کہا ہے اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن کریم نے مومن اور مسلم میں مستقل طور پر یہ تفریق کی ہے۔ بالکل نہیں۔ اس نے مومن اور مسلم کے الفاظ مرادف معنوں میں بھی استعمال کئے ہیں اور مومنوں کی عظیم ترین شخصیتوں — حتّٰی کہ حضرات انبیاء کرام منجملہ نبی اکرمؐ — کو مسلم کہہ کر پکارا ہے۔ اس نے فرق یہ بتایا ہے کہ جو لوگ کسی مصلحت کی خاطر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو

جائیں یا محض مسلمانوں کے گھر پیدا ہو جانے سے مسلمان کہلائیں۔ انہیں اپنے آپ کو مومن نہیں کہنا چاہیئے تاآنکہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست نہ ہو جائے۔ ورنہ، عام معنوں میں، مومن اور مسلم دونوں ہی ہیں مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ لَّهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۲/۱۱۲)۔ جنہوں نے اپنی تمام خواہشات اور توجہات کو قوانینِ خداوندی کے تابع رکھا اور اس طرح نہایت متوازن زندگی بسر کی۔ سو اس کے اعمال کا اجر اس کے نشوونما دینے والے کے پاس ہے۔ اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ لہٰذا، مومن اور مسلم وہ ہے جسے نہ خارج سے کسی قسم کے خطرہ کا خوف ہو اور نہ داخلی طور پر اس کے دل میں یاس و حزن کا گزر ہو یہ ہے مقامِ مومن اور اندازِ مسلم۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

(ضربِ کلیم)

مفہومُ القرآن

قرآن مجید مروجہ ترجموں اور عام تفسیروں سے سمجھ میں نہیں آسکتا، یہ اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربیِ مبین کی مستند کتبِ لغت کی رُو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون سے متعلق مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔ مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے مرتب کیا ہے جو مفہوم القرآن کے نام سے (مع متن) عمدہ دبیز کاغذ پر تین مطلا جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ قیمت:- فی جلد -/۶۰ روپے
مکمل سیٹ ۳ جلد -/۱۸۰ روپے

لغاتُ القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے، اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن مجید نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا کیا مقام متعین کرتا ہے چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ قیمت:- فی جلد -/۵۰ روپے
مکمل سیٹ -/۲۰۰ روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام بی/۲۵ گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

طلوعِ اسلام کے چندے میں اضافہ

بیرونی ممالک کے لئے

طلوعِ اسلام میں اضافہ کا اعلان صـ۱۶ پر شائع ہو رہا ہے۔ یہ اضافہ ایک روپیہ فی پرچہ اور -/۱۲ روپے سالانہ ہے۔ وہ اعلان اندرونِ ملک خریداروں تک محدود ہے۔ اس نسبت سے بیرونِ ملک خریداروں کے سالانہ چندہ میں بھی جنوری ۱۹۸۴ء سے اضافہ ہوگا۔ جس کی رُو سے ان ممالک کا سالانہ چندہ حسبِ ذیل ہوگا۔

(۱) غیر ممالک بذریعہ بحری ڈاک = -/۹۸ روپے

(۲) غیر ممالک بذریعہ ہوائی ڈاک :-

(i) خلیجی اور عرب ممالک (ایران، عراق، عرب امارات، کویت، سعودی عرب وغیرہ) = -/۱۲۸ روپے

(ii) انڈیا، برما، سری لنکا، جزائر مالدیپ وغیرہ = -/۱۳۳ روپے

(iii) افریقہ کے ممالک (لیبیا، کینیا، یوگنڈا، مصر، جنوبی افریقہ) = -/۱۴۳ روپے

(iv) یورپ کے ممالک (برطانیہ، فرانس، ناروے وغیرہ) = -/۱۴۸ روپے

(v) بنگلہ دیش، فلپائن، سنگاپور، ملائیشیا، جاپان وغیرہ = -/۱۴۸ روپے

(vi) نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، جزائر فجی وغیرہ = -/۱۹۳ روپے

(vii) امریکہ، کینیڈا وغیرہ = -/۲۰۸ روپے

(۳) مذکورہ بالا چندہ میں خرچ ڈاک شامل ہے۔ البتہ جو خریدار پرچہ بذریعہ رجسٹری منگوانا چاہیں انہیں فیس رجسٹری (-/۳ روپے فی پرچہ) الگ ادا کرنا ہوگا۔

(۴) ہمیں امید ہے کہ ہماری مجبوری مشکلات کے پیشِ نظر خریدار حضرات اس اضافہ کو بطیبِ خاطر قبول فرمائیں گے۔ ادارہ طلوعِ اسلام ان احباب کے تعاون کا متمنی رہتا ہے

والسلام!

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک

(جسے معلوماتِ عامہ کے لئے وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے۔)

(۱) تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے رہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

(۲) خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ابد تک ضابطۂ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضورؐ رسالتمآب خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

(۳) قرآنِ کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابعِ تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے

(۴) کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

نبیؐ اکرم کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے۔ سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہیئے۔

(۵) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظامِ مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظامِ زندگی کا نام ہے) ممکن نہیں ہو سکتا۔

(۶) رسول اللہؐ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے تمام امورِ مملکت مسلمانوں کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

(۷) رسول اللہؐ کے بعد دین کا وہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدین نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآنِ کریم نے

صرف اصول دیتے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔

(۸) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے اُمت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور، دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن اب مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

(۹) ہمارے لئے کام کرنے کا یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو اُمت کو احکام و قوانینِ خداوندی کے مطابق چلائے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے تابع ہو گی۔

(۱۰) چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہو گا۔ اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہو گا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کیلئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہمد گر مدغم ہو جائیں گے۔

(۱۱) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا، اُمت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز، روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اُسے "خدا اور رسول" کا طریقہ قرار دے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی، روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

(۱۳) قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

(۱۴) جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآنِ کریم کے مطابق ہو، یا جس سے حضور نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

(۱۵) ہم، رسول اللہؐ کے بعد، ہر قسم کے مدعیٔ وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

(۱۶) طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقۂ اہلِ قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ اُمت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں، ہم ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کرتے۔ اور بلا ردّ و بدل ان کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم قرآنِ کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مسلک، جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔

ابلیس و آدم

پرویز صاحب نے جب سلسلہ معارف القرآن شروع کیا تو من و یزداں (اللہ) کے بعد دوسری جلد ابلیس و آدم کے عنوان سے شائع کی تھی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۲ء میں۔ اس کے بعد یہ کتاب کمیاب تھی۔ اس لئے اس کا چوتھا ایڈیشن شائع کرنا پڑا

کتاب کے مشمولات سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

۱۔ انسان کی تخلیق۔ ۲۔ نظریۂ ارتقا۔
۳۔ قصہ آدم۔ ۴۔ ابلیس۔
۵۔ شیطان۔ ۶۔ جنات۔
۷۔ ملائکہ۔ ۸۔ روح (نفس)
۹۔ وحی (کشف و الہام)۔ ۱۰۔ نبوت اور رسالت۔
۱۱۔ کیا تمام مذاہب سچے ہیں؟

کتاب دستیاب بہترین سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ بڑی تقطیع ضخامت پونے چارسو صفحات۔
جلد مضبوط خوبصورت مزین اور مطلا قیمت فی جلد -/۷۵ روپے علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

۱۔ مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار۔ لاہور
۲۔ ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ ۲۔ لاہور